پاکستان کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا بچوں کا مقبول ترین ہفت روزہ

بچوں کا اسلام

1104

ہر اتوار کو روزنامہ اسلام کے ساتھ شائع ہوتا ہے

اتوار 29 ربیع الاوّل 1445ھ
مطابق 15-اکتوبر 2023ء

وہ ایک قدم

سورج کی کرن نے کیا دیکھا؟

القرآن

اللہ کا ذکر اطمینان و سکون کا ذریعہ

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اُن کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان کے لیے خوشحالی اور نیک انجامی ہے۔

(سورۂ رعد، آیت: 28,27)

الحدیث

نا قابلِ اطمینان امور

حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث یاد ہے کہ ایسے کاموں کو ترک کر دو جو تمھیں شک میں ڈالیں، ایسے کام کرو جن پر دل مطمئن ہو، کیونکہ اچھائی اور اچھا کام اطمینان کا ذریعہ ہوتا ہے جبکہ برائی اور برا کام عدمِ اطمینان کا باعث ہوتا ہے۔

(طبرانی)

دستک

خوشی کی ایک انمول خبر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

شمارہ نمبر ۱۱۰۰ کی دستک کا اختتام کچھ اِن الفاظ میں ہوا تھا کہ ”افسردہ افسردہ خبروں کو چیر کر خوشی کی ایک خبر بھی چہکتی ہوئی ہم تک آن پہنچی ہے، اور یہ خبر بچوں کا اسلام کے ہزارویں شمارے کے حوالے سے ہے جو اگلے ہفتے ہم سنائیں گے۔“

ہوا مگر یہ کہ اگلے ہفتے ربیع الاول کا خصوصی مہکتا شمارہ آ گیا، پھر دوسری کچھ اور ”دادا گیر“ باتیں ایسی آ گئیں جو اس معصوم سی خوشی کی خبر کو پچھاڑتے ہوئے آگے آ گئیں، لیکن آج ہم نے اُس معصوم کی انگلی کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔

تو سنیے بلکہ پڑھیے، ہوا یوں کہ قریب سوا سال قبل ۱۴-اگست کی ایک سہ پہر جبکہ سورج کی ٹکیہ سارا دن آکاش کی تھالی پر جلتی بھونتی سنہری روپہلی سے نارنجی مائل ہو چکی تھی اور مغرب میں گرنے ہی والی تھی، ہمارے ان باکس پر انجانی سی ایک دستک ہوئی۔

اتفاق سے اُس وقت ہم فارغ تھے، سو نام جانے بنا فوراً کواڑ کھول دیے۔

دوسری طرف ”دائرہ بچوں کا اسلام“ کی ایک بھتیجی تھیں جو مسنون سلام کر، آداب بجا لا، شرماتے ہوئے اپنا نام رافعہ سعدیہ بتاتی تھیں۔

ہم نے مسنون جواب عرض کرتے ہوئے کہا:

”فرمائیے۔“

کہنے لگیں کہ میں بچوں کا اسلام کی ابتدائی شمارے ہی سے قاری ہوں۔ غازی یونیورسٹی ڈیرہ غازی خان کے شعبہ علوم اسلامیہ سے ایم فل کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں اور اِس مقصد کے لیے بچوں کا اسلام کے تاریخی سالنامے ”اَلف نمبر“ پر ایم فل کا مقالہ لکھنا چاہتی ہوں، جس میں بطور تمہید بچوں کا اسلام کے دونوں ادوار پر کچھ ابواب بھی ہوں گے، اس سلسلے میں آپ کی کچھ رہنمائی درکار ہے۔

ظاہر ہے ہمیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی، کیونکہ اگر ایسا ہو جاتا تو پاکستان کی تاریخ میں جہاں ہمارے اَلف نمبر نے اور بہت سے ریکارڈ اپنے نام کیے تھے، یہ ایک اور منفرد اعزاز بھی اپنے نام کر لیتا، کیونکہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ آج تک بچوں کے کسی بھی رسالے کے کسی سالنامے یا خاص نمبر پر ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سطح پر کبھی کوئی تحقیقی مقالہ نہیں لکھا گیا ہے۔

گویا اِس خبر سے ”اَلف نمبر“ کے دامن میں دوسرے، بہت سارے منفرد اعزازات کے ساتھ ایک اور منفرد اعزاز کا اضافہ ہونے جا رہا تھا تو ہمیں خوشی بھلا کیوں نہ ہوتی......!

تو جناب! پھر سال بھر محترمہ رافعہ سعدیہ سے رابطے میں رہے، حتی الامکان رہنمائی بھی کی اور معلومات کی تصحیح بھی۔ اور آخرکار ۲۴ جولائی ۲۰۲۳ء کو رافعہ صاحبہ نے نگران مقالہ جناب ڈاکٹر محمد ایاز کی زیرِ نگرانی ”اَلف نمبر (بچوں کا اسلام): تجزیاتی و تحلیلی مطالعہ“ کے عنوان سے اپنے مقالے کا دفاع، ممتحن جناب ڈاکٹر نسیم اختر صاحب کے سامنے بڑی کامیابی کے ساتھ کیا اور یوں اب وہ بچوں کا اسلام کے عالمی ریکارڈ یافتہ خاص الخاص ہزارویں شمارے ”اَلف نمبر“ کی انگلی تھامے ایم فل کی سند حاصل کر چکی ہیں۔

ہفت روزہ بچوں کا اسلام اِس شاندار کامیابی پر محترمہ رافعہ سعدیہ کو بہت مبارک باد پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ آئندہ زندگی میں اس سے بڑھ کر بڑی بڑی تعلیمی و عملی کامیابیاں آپ کا نصیب بنیں۔

اِس موقع پر ہم اپنی جیب خاص سے بھتیجی صاحبہ کو انعام دینے کا اعلان بھی کرتے ہیں۔

اچھا ابھی ایک خیال آیا ہے کہ ”اَلف نمبر“ پر مقالہ تو چلیے خود ”اَلف نمبر“ ہی کی طرح منفرد ٹھہرا لیکن جس طرح باقی دوسرے رسائل پر ایم فل یا پی ایچ ڈی سطح کے مقالے لکھے گئے ہیں، کیا بچوں کا اسلام جیسے مقبول ترین اور کثیر الاشاعت رسالے پر بھی ڈاکٹریٹ یا ایم فل سطح کے مقالے لکھے گئے ہیں......؟

ہم چونکہ بانی مدیر حضرت اشتیاق احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے وصال پر ملال کے بعد مدیر بنے ہیں تو ہمیں اِس بابت کچھ معلوم نہیں۔ قارئین کو معلوم ہو تو ضرور بتائیں۔

چلتے چلتے ایک بار پھر بیٹی صاحبہ کو بہت مبارک ہو اور اگلے برسوں میں ڈاکٹریٹ کے لیے ڈھیروں نیک تمنائیں۔

والسلام

محمد فیصل شہزاد

سونے کی اینٹ

سعید احمد۔ ٹنڈو آدم

وہ ایک غریب انسان تھا۔ سارا دن محنت مشقت کرتا پھر کہیں جا کر اسے دو وقت کی روٹی میسر ہوتی۔ روکھی سوکھی روٹی کھا کر پانی پیتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا۔ وہ جس قدر غریب تھا، اسی قدر رحم دل بھی تھا۔ لوگوں سے ہمدردی رکھتا، ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا اور ان کی مدد کرتا۔

محنت مشقت کرنے کے بعد اس کے پاس جو وقت بچتا، وہ اسے یادِ الٰہی میں صرف کرتا۔ اس نے بے جا کبھی کسی چیز کی تمنا نہیں کی تھی۔ وہ صبح سویرے اٹھتا، نماز پڑھتا، تلاوت کے بعد ناشتہ کرتا اور کام پر روانہ ہو جاتا۔

زندگی سکون اور اطمینان کے ساتھ اسی ڈگر پر چلی جا رہی تھی کہ ایک دن اس کی زندگی میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس کا آرام اور سکون اس سے چھن گیا۔

ہوا یوں کہ ایک دن وہ ایک ویران راستے پر چل رہا تھا۔ خاموشی سے خدا کو یاد کرتا ہوا اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوا کہ اچانک ایک چیز دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

حیرت سے اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ چند قدم آگے بڑھا اور اس چیز کے پاس آ کر رک گیا۔

وہ سونے کی ایک اینٹ تھی۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور بے حد خوش ہوا۔

وہ سونے کی اینٹ کیا تھی، اس کے ہاتھ گویا بادشاہت آ گئی، اس کی دنیا ہی بدل کر رہ گئی۔ اچانک اس کے دل میں نت نئی خواہشات سر اٹھانے لگیں۔

کبھی وہ سوچتا کہ بڑا عالیشان محل بنوایا جائے، جہاں خادموں کی ایک لمبی قطار ہو۔ ایسا محل جس کے برج دور سے دکھائی دیں۔ اس میں ایک بڑا سا خوبصورت پائیں باغ ہو، جہاں قسم قسم کے درخت ہوں، جن پر پرندے چہچہا رہے ہوں۔ سواری کے لیے شاندار بگھیاں ہو، پہننے کے لیے زرق برق لباس ہوں، انواع و اقسام کے کھانے ہوں، عربی النسل کے عمدہ گھوڑے ہوں۔

وہ زرق برق لباس پہن کر جب بگھی میں سوار ہو کر محل سے نکلے تو اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کا ایک ہجوم در آئے۔ لوگ عاجزی سے اس کے آگے جھک جائیں۔

اب وہ ہر وقت انہی سوچوں میں گم رہنے لگا تھا۔ پھر ایک دن انہی سوچوں میں وہ گھومتا ہوا قبرستان کی طرف نکل گیا۔

یہاں بالکل سکوت طاری تھا۔ اس نے دیکھا کہ گورکن ایک قبر پر مٹی ڈال رہا ہے۔

یہ دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی سوچ کے دھارے بدل گئے۔ دنیا کی حقیقت کھلنے لگی۔ غفلت کے پردے چھٹ گئے۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور زیرِ لب بڑبڑایا:

’’میں بھی کتنا احمق ہوں، سونے کی ایک ذرا سی اینٹ نے مجھے میرے خدا سے غافل کر دیا۔ میں نے اپنے دل میں دنیا کو بسا لیا اور خدا کو دل سے نکال دیا۔ یہ کیسی اینٹ ہے جس نے مجھ پر غفلت کے پردے ڈال دیے، آخرت کی محبت بھلا دی اور دنیا کی محبت سے میرے دل کو بھر دیا۔ میں خدا کو چھوڑ کر سونے کا پجاری بن گیا۔‘‘

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔

وہ سوچنے لگا:

’’موت تو ایک دن آ کر رہنی ہے، سونے چاندی کی اینٹیں یہیں رہ جائیں گی۔ یہ میرے کسی کام نہ آئیں گی، پھر ایسی ہوس کا کیا فائدہ؟ یہ تو چند روزہ عیش و عشرت کا سامان ہے، قبر کی تاریکی یہ سب کچھ چھین لے گی۔ ایک دن میں بھی اسی طرح منوں مٹی تلے سویا ہوں گا، کوئی میری قبر پر بھی مٹی ڈال رہا ہوگا۔ میں اس سونے کی اینٹ کو پا کر سب کچھ بھول گیا تھا، اپنی زندگی کا مقصد بھی، اسی لیے اپنی آخرت خراب کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ اے میرے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تُو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ یا اللہ! تیرا شکر ہے میرے مولا!‘‘

وہ بولتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کھیسے سے وہ اینٹ نکالی اور اسے ایک گڑھے میں پھینک کر ہاتھ جھاڑنے لگا۔

(ماخوذ حکایت سعدی)

☆☆☆

حکایتِ سعدی

احمق پرندہ

ایک خوشگوار دن ایک شکاری سرسبز و شاداب چراہ گاہ میں پرندوں کا شکار کرنے کے لیے نکلا۔ اس نے پھندے کے طور پر غلے کے چند دانے زمین پر پھینکے اور جھاڑی کے پیچھے چھپ کر انتظار کرنے لگا۔ پرندوں سے خود کو چھپانے کے لیے شکاری نے اپنے آپ کو سرسبز گھاس اور پتوں میں لپیٹ لیا۔

جلد ہی ایک پرندہ آیا، آدمی کے گرد چکر کاٹا اور پوچھا: ’’تم کون ہو؟ تم چراہ گاہ میں دوسرے جنگلی جانوروں کی طرح خود کو سرسبز گھاس میں لپیٹ کر کیا کر رہے ہو؟‘‘

شکاری نے کہا:

’’میں ایک تارک الدنیا درویش ہوں اور گھاس پھونس پر قناعت کیے ہوئے ہوں۔‘‘

پرندے نے زمین پر غلے کے بیج دیکھے اور شکاری سے کہا: ’’یہ کس کے ہیں؟‘‘

شکاری نے جواب دیا: ’’ایک غریب، لاچار، یتیم اِنھیں میرے حوالے کر گیا تھا۔‘‘

پرندے نے التجا کی: ’’میں بہت بھوکا اور کمزور ہوں۔ اس وقت نجس بھی ملے تو میں کھا لوں گا۔ اے درویش تمھارا کیا نقصان، مجھے وہ دانے کھانے کی اجازت دو۔‘‘

شکاری پرندے کی بے صبری اور مایوسی کو محسوس کر رہا تھا۔ اچانک پرندہ خود پر قابو نہ پاتے ہوئے دانوں پر جھپٹا اور شکاری کے پھندے میں پھنس گیا۔ شکاری نے مہارت سے پرندے کو مارا اور گھر روانہ ہو گیا۔ اس طرح پرندے کو اپنی جلد بازی اور خود پر قابو نہ پانے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

مرسلہ: زرینہ شبیر احمد، پہاڑ گنج، کراچی

خط کتابت کا پتا: دفتر روزنامہ اسلام، ناظم آباد، کراچی bkislam4u@gmail.com, 021 366 099 83

ادارۂ روزنامہ اسلام کی تحریری اجازت کے بغیر بچوں کا اسلام کی کوئی تحریر کہیں شائع نہیں کی جاسکتی۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کرنے کا حق رکھتا ہے۔

سالانہ زرِ تعاون: اندرونِ ملک 1500 روپے بیرونِ ملک ایک میگزین 22000 روپے دو میگزین 25000 روپے انٹرنیٹ: www.dailyislam.pk

وہ ایک قدم

علی اکمل تصور

وہ بہت دیر سے ہوائی اڈے کی انتظار گاہ میں بیٹھا سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔

فلائٹ میں ابھی وقت تھا۔ اُسے پورے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کے والدین اور چھوٹے بہن بھائی ساتھ آنے کی ضد کر رہے تھے، لیکن اس نے روک دیا تھا۔ جب آگے کا سفر اس نے اکیلے ہی طے کرنا تھا تو پھر اس سفر کا آغاز گھر ہی سے ہونا چاہیے تھا۔ ویسے بھی وہ کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھر سے رخصت ہوا تو وہ بہت خوش تھا۔ یہ خواب سے تعبیر تک کا سفر تھا۔ اُس نے اِس سنہری موقع کے انتظار میں بہت سے سال گزار دیے تھے اور اب کام یابی اُس کے قدموں کے نیچے موجود تھی۔ بس ایک قدم جو اُسے اپنے دیس سے پردیس لے جاتا اور پھر ہر دن عید کا دن ہوتا، ہر رات شب برأت ہوتی، مگر راستے میں ایک ایسا واقعہ ہو گیا تھا کہ اُس کے دل و دماغ کی دنیا میں بھونچال آ گیا تھا۔ مسافتوں اور منزلوں کا مفہوم ہی بدل کر رہ گیا تھا۔

وہ گھر سے نکلا تو ائیر پورٹ تک آنے کے لیے اسے ایک ٹیکسی کی ضرورت تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد اسے ایک ٹیکسی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بزرگ صورت آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے نورانی چہرے پر سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی موجود تھی۔

''صاحب! آپ نے کہاں جانا ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''ائیر پورٹ۔''

اِس مختصر جواب کے ساتھ وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تھا۔

اُس بزرگ صورت آدمی نے ٹیکسی آگے بڑھا دی تھی۔

وہ پوری احتیاط کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

''میں فیض بابا ہوں، سب مجھے اِسی نام سے پکارتے ہیں۔ آپ اپنا وطن چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟''

''اپنا وطن......!'' عباس طنز سے مسکرایا۔

''کس وطن کی بات کرتے ہو؟ اِس ملک نے آخر ہمیں دیا ہی کیا ہے۔ وہ تو میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے باہر جانے کا موقع مل رہا ہے۔ بس قدم جماتے ہی میں اپنے گھر کے تمام افراد کو وہاں لے جاؤں گا۔''

فیض بابا فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''صاحب! گستاخی معاف...... کیا اِس پاک وطن کی نوجوان نسل نے اس نکتے پر سوچنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ انھوں نے خود اِس ملک کو کیا دیا ہے؟''

یہ ایک سلگتا ہوا سوال تھا جس کا کوئی جواب عباس کے پاس موجود نہیں تھا، کیوں کہ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا وہ دُوسرے ملک جا کر ملازمت کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اب وہ دونوں خاموش تھے۔ ٹیکسی ائیر پورٹ کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اچانک فیض بابا کے موبائل پر ایک کال آئی۔

گھنٹی کی آواز سنتے ہی فیض بابا نے ٹیکسی سڑک کنارے روک لی۔

''خیریت تو ہے نا؟'' فیض بابا نے کال ریسیو کا بٹن اوکے کرتے ہوئے پہلا سوال یہ پوچھا تھا، پھر وہ دُوسری طرف کی بات سننے لگا۔ خاموشی کی وجہ سے عباس کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ دُوسری طرف کوئی خاتون ہے۔

اب فیض بابا کے چہرے پر دُکھ اور پریشانی کے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔

عباس کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ نجانے کیوں اس کے دل میں یہ بات جاننے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ آخر ڈرائیور پریشان کیوں ہو گیا ہے؟ پھر اُسے اپنے سوال کا جواب خود ہی مل گیا۔

''صاحب! ایک مشکل آ پڑی ہے۔ میں آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا نہیں پاؤں گا۔ آپ یہاں سے دُوسری ٹیکسی لے لیجیے۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے۔''

فیض بابا کی آواز لرز رہی تھی۔

''آخر ہوا کیا ہے؟'' عباس بے تابی سے بولا۔

''میری بیٹی کا فون تھا۔ میرا نواسہ بیمار ہے اور اب وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔ مجھے فوراً جانا ہوگا۔''

''کیا گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟''

''نہیں۔۔۔ میرا داماد اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ ہم بس باپ بیٹی ہیں اور یہ بچہ ہے۔''

فیض بابا کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔

”میری فلائیٹ میں ابھی کافی وقت ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں، شاید میں آپ کی کوئی مدد کر پاؤں۔“ عباس نے کچھ سوچ کر کہا۔

فیض بابا رضامند ہو گیا۔ اُس نے فوراً ہی اپنی ٹیکسی کا رُخ موڑ دیا۔

اب گاڑی جیسے ہوا سے باتیں کر رہی تھی، پھر فیض بابا کا گھر آ گیا۔

عباس ٹیکسی میں بیٹھا رہا۔ فیض بابا گھر کے اندر گیا اور پھر ایک بے ہوش بچے کو گود میں اُٹھائے واپس لوٹا۔ بچے کو عباس نے سنبھال لیا۔ اب ٹیکسی اسپتال کی طرف سفر کر رہی تھی۔ عباس نے بچے کی کلائی پکڑ کر ٹمپریچر اور نبض کا احساس کیا تھا۔ خطرے والی بات نہیں تھی مگر علاج ہونا ضروری تھا۔ وہ جب اسپتال پہنچے تو وہاں ایک عجیب منظر اُن کا منتظر تھا۔

اسپتال کے تمام ڈاکٹر ہڑتال پر تھے۔ ایمرجنسی میں اسٹاف تو موجود تھا مگر کوئی ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ مریضوں کے لواحقین بوکھلائے پھر رہے تھے۔ عباس نے بہت سی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ایمرجنسی کے باہر بہت سے مریض موجود تھے، مگر اُن کا علاج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسٹاف ڈاکٹر کی ہدایت اور تشخیص کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

بچہ عباس نے اُٹھا رکھا تھا۔ نجانے کیوں اُسے غصہ آ رہا تھا۔ وہ وارڈ کی طرف بھاگا۔

”رُک جائیے...... رُک جائیے...... ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں!“

ایک نرس نے عباس کو روکنے کی کوشش کی۔

”جانتا ہوں، مگر مریض کے ساتھ ڈاکٹر بھی آیا ہے۔“

”کہاں؟“ نرس اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”میں ہوں ڈاکٹر عباس!“ عباس نے اپنا تعارف کروایا تھا۔

ایمرجنسی میں موجود عملہ فوراً ہی الرٹ ہو گیا تھا۔ فیض بابا تو حیران رہ گیا تھا۔ عباس کی ہدایت پر ضروری سامان لایا گیا اور عباس خود اُس بچے کو ابتدائی طبی امداد دینے لگا تھا۔

چند منٹوں میں ہی بچے کو ہوش آ گیا۔ اب ڈرپ کی مدد سے ادویات بچے کے جسم میں پہنچ رہی تھیں۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بچے کی حالت بہتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

”فکر والی کوئی بات نہیں ہے۔ کل تک علاج جاری رہے گا، پھر آپ بچے کو گھر لے جا سکیں گے۔“ عباس نے فیض بابا سے کہا تھا۔

”بہت... بہت شکریہ صاحب!“ فیض بابا نے عباس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ اُس کے آنسو عباس کے ہاتھوں کو بھگو رہے تھے۔

”کچھ نہیں ہوگا، سب ٹھیک ہے۔“ عباس نے اُسے دلاسا دیا تھا۔

”چلیے صاحب! میں آپ کو ائیر پورٹ چھوڑ آؤں۔“

اب فیض بابا ٹیکسی کی طرف بڑھا مگر اِس سے پہلے کہ عباس قدم اُٹھاتا، ایک آواز عباس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”ڈاکٹر صاحب! ہمارا علاج کون کرے گا؟“

عباس نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک بوڑھی ماں تھی۔

سنت کہانی (اوّل - دوم)

اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور جنت کے حصول کے لیے پیارے نبی
حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سنتِ مبارکہ
بلاشبہ کامل ترین.... خوب صورت ترین.... اور آسان ترین راستہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کے لیے....
بچوں کو بچپن ہی سے پیاری.... مبارک سنتوں....
اور.... پاکیزہ طریقوں کا عادی بنانے کے لیے....

بچوں اور بچیوں کے لیے اچھوتے.... اور آسان انداز میں لکھی گئی....
نصیحت آموز کہانیاں.... دیدہ زیب کتابی شکل میں....

آئیں! مل کر کتاب دوستی کو فروغ دیں اور اس پیغام کو عام کریں۔

بیت العلم

کراچی فون: 021-32726509 ، موبائل: 0309-2228089
لاہور فون: 042-37112356
Visit us: www.mbi.com.pk maktababaitulilm

عباس کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی انجان طاقت نے اُس کے دل کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا ہو، پھر عباس نے اپنی جیب میں سے موبائل نکالا اور ایک نمبر ملایا۔ یہ ائیر پورٹ کا امدادی نمبر تھا۔ وہ اپنی فلائٹ کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

''کیا کہا؟ فلائٹ تین گھنٹے لیٹ ہے۔ ٹھیک ہے، شکریہ!''

عباس نے ایمرجنسی کے باہر موجود تمام مریضوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر شوخ آواز میں بولا: ''آ جاؤ سب۔''

تمام مریضوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

عباس ڈاکٹر کے کمرے میں آ بیٹھا۔ ایمرجنسی وارڈ میں موجود اسٹاف پوری طرح متحرک ہو چکا تھا۔ ایک ایک کر کے مریض آ رہے تھے اور عباس سنجیدہ نوعیت کے مریضوں کو وارڈ میں داخل کر رہا تھا اور باقیوں کو ادویات تجویز کر کے رخصت کر رہا تھا۔

تین گھنٹے سے پہلے ہی ہجوم چھٹ چکا تھا اور اب عباس کو اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔

فیض بابا اُس کے ہمراہ تھا۔ آخری بار عباس نے وارڈ میں چکر لگایا۔

سب مریض اور اُن کے لواحقین اُسے شکر گزار نظروں سے دیکھ رہے تھے، پھر عباس ٹیکسی میں آ بیٹھا۔ ایک بار پھر سے ائیر پورٹ کی طرف سفر شروع ہو چکا تھا۔

وقفے وقفے سے عباس ائیر پورٹ کے امدادی نمبر سے معلومات لے رہا تھا۔ فلائٹ لیٹ تھی پھر ٹیکسی ائیر پورٹ کی پارکنگ میں آ کر رُک گئی۔

''اچھا فیض بابا! اللہ نے چاہا تو پھر ملیں گے۔''

عباس نے فیض بابا سے رُخصت کی اجازت لی تھی۔

''مت جاؤ صاحب! اس ملک کو، اس ملک کے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے صاحب۔'' فیض بابا سسک پڑا تھا۔

عباس کا دل تڑپ کر رہ گیا تھا۔ اتنی محبتیں، اتنی چاہتوں کی اُسے کب اُمید تھی۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں آگے بڑھ گیا۔

اس کی منزل اُسے پکار رہی تھی اور اب وہ انتظار گاہ میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔

نجانے کیوں محض تین ساڑھے تین گھنٹوں میں اس کے لیے مسافتوں اور منزلوں کا مفہوم بدل کر رہ گیا تھا، پھر اُس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ اُس کی فلائٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔ سب مسافر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ عباس بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اب وہ دوراہے پر کھڑا تھا۔

سامنے وہ دروازہ تھا جو اُس کے بچپن کے خواب، اس کی منزل کی طرف جاتا تھا۔ پیچھے واپسی کا دروازہ تھا اور دونوں دروازے کھلے تھے۔

اُس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ یہ قدم بہت وزنی تھا۔

پھر اُس نے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ یہ قدم بہت ہلکا تھا۔

وہ مسکرانے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟

فیض بابا نے کہا تھا:

''کیا نئی نسل نے اس نکتے پر سوچنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ اُنھوں نے پاک وطن کو کیا دیا ہے؟''

اب عباس نے پاک وطن کو کچھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ ''کچھ'' سوائے ''خدمت'' کے اور کچھ نہیں تھا۔

جب عباس ائیر پورٹ کی حدود سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فیض بابا اپنی ٹیکسی کے پاس کھڑا تھا۔

''آپ گئے نہیں؟'' عباس بول پڑا۔

''کیسے چلا جاتا، جب کہ مجھے یقین تھا کہ آپ جا نہیں پائیں گے۔''

فیض بابا کی خوشی دیدنی تھی، جب کہ عباس اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

''آپ کو کیسے یقین تھا؟''

''کبھی بچے بھی اپنی ماؤں کو چھوڑ کر جاتے ہیں۔ آیئے صاحب! اب واپس لوٹ چلتے ہیں۔'' فیض بابا نے ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا تھا۔

عباس خاموشی سے ٹیکسی کے اندر بیٹھ گیا تھا اور پھر واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

وہ سفر جو پاک وطن کو ترقی اور خوش حالی کے راستے پر ڈالنے کا سبب بننے والا تھا۔

☆☆☆

درود و سلام کے مسنون صیغے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''زاد السعید'' کے نام سے صلوٰۃ و سلام پر مشتمل چالیس صیغے جمع فرمائے۔

حضرت لکھتے ہیں: ''جو صیغے صلوٰۃ و سلام کے احادیث میں آئے ہیں اُن میں سے چالیس صیغے پیش ہیں جن میں سے پچیس صلوٰۃ کے اور پندرہ سلام کے ہیں۔''

انہی مسنون صیغوں سے ہر ہفتے درود و سلام کا ایک صیغہ پیش کیا جا رہا ہے۔

قارئین! انھیں یاد کیجیے، روزانہ پڑھنے کا اہتمام کیجیے اور اپنے دوستوں کو بھی یاد کروایئے۔ اس طرح درود و سلام کا اجر بھی ملے گا، تلاوت حدیث کا بھی اور چالیس احادیث یاد کرنے پر از روئے حدیث قیامت کے دن علماء کرام کے ساتھ اٹھائے جانے کی بشارت کے مستحق بھی آپ بن جائیں گے۔ (مدیر)

صلوٰۃ کا تیسرا صیغہ:

اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ الْقَائِمَۃِ وَالصَّلٰوۃِ النَّافِعَۃِ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ ارْضَ عَنِّیْ رِضًا لَّا تَسْخَطُ بَعْدَہٗ اَبَدًا۔

سلام کا تیسرا صیغہ:

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ الطَّیِّبَاتُ الصَّلَوَاتُ لِلّٰہِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ، اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

***

میرحجاز

77

(خصوصی طور پر بچوں کا اسلام کے نوعمر قارئین کے لیے سہل اور عام فہم انداز میں تلخیص کیا گیا!)

اختر حسین عزمی

''چچا جان! جو دستاویز قریش نے خانہ کعبہ میں لٹکائی تھی، اس کی ساری ظالمانہ دفعات کو دیمک چاٹ گئی ہے، لیکن اس عبارت میں جہاں اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی لکھا تھا وہ جوں کا توں سلامت ہے۔''

ابوطالب کو یہ بات جب ان کے بھتیجے نے بتائی تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ انھوں نے تعجب سے پوچھا: ''بھتیجے! کیا یہ بات تیرے رب نے تجھے بتلائی ہے؟''

ابوطالب جانتے تھے کہ وحی کے ذریعے کے سوا کوئی اور ذریعہ ان کے پاس نہ تھا، کیونکہ ان کے بھتیجے کو خانہ کعبہ میں داخل ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔

''بے شک۔'' اللہ کے رسولؐ نے کہا۔

''چمک دار ستاروں کی قسم! پھر تو تم پر کوئی فتح یاب نہیں ہو سکتا، کیونکہ تم کبھی جھوٹ نہیں بولتے ہو۔''

ابوطالب اپنے بھتیجے کی خبر کے بارے میں پُریقین تھے، پھر انھوں نے بنوہاشم کے چند افراد کو اپنے ساتھ لیا اور سوئے حرم روانہ ہوئے۔

صحن حرم آج قریش سے بھرا پڑا تھا۔ جب انھوں نے ابوطالب کے ساتھ بنوہاشم کے معززین کو آتے دیکھا تو کہنے لگے:

''لگتا ہے کہ ابوطالب کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔'' ایک سردار نے کہا۔

قریش کی مجلس میں پہنچ کر ابوطالب نے سرداران قریش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''یا معشر القریش! ایک واقعہ رونما ہوا ہے۔ ممکن ہے وہ ہمارے اور تمھارے درمیان صلح کا ذریعہ بن جائے۔ تم اپنا وہ عہد نامہ لے آؤ۔''

یہ انھوں نے اس لیے کہا تا کہ قریش اسے لانے سے پہلے دیکھ نہ لیں۔

قریش کی خوشی دیدنی تھی۔ انھیں یقین ہو چلا تھا کہ ابوطالب اب اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر ہی دیں گے۔

''میں تمھیں ایک انصاف کی بات کہتا ہوں، اگر تم اسے مان لو تو ہمارے اور تمھارے درمیان صلح ہو سکتی ہے۔''

''وہ کیا بات ہے؟'' سب نے بیک زبان پوچھا۔

''میرا بھتیجا کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اس عہد نامے سے بری ہے جو تم نے ہمارے خلاف کیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے دیمک نے قطع رحمی والی تمام دفعات مٹا دی ہیں اور اس نوشتے میں صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ اگر میرا بھتیجا اس بات میں جھوٹا ہے تو ہم اس کو تمھارے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور اگر وہ سچا ثابت ہوا اور خدا کی قسم اس نے کبھی جھوٹ بولا نہیں ہے، تو ہم ہرگز اسے تمھارے حوالے نہیں کریں گے، لہٰذا پھر تمھیں اس ظلم اور قطع تعلقی سے باز آنا ہوگا۔ کیا تمھیں میری بات منظور ہے؟''

ابوطالب فیصلہ کن انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

''ہمیں منظور ہے۔'' بیک وقت قریش کی آوازیں بلند ہوئیں اور عہد و پیمان طے ہو گیا۔

●●

ادھر ابوالحکم اور زہیر کے ساتھیوں کے درمیان نوک جھونک اس نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی کہ مطعم بن عدی مقاطعے کی دستاویز کو چاک کرنے کے لیے اٹھا۔ اس کے ساتھ اور لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر ابوطالب کے ساتھ قریش کے دیگر سردار خانہ کعبہ کے اندر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے معاہدے کی لکھی ہوئی تمام شقوں کو دیمک نے چاٹ لیا تھا اور اس جملے پر صرف باسمک اللھم باقی رہ گیا تھا۔

قریش بڑی حیرانی سے دیکھے جا رہے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات میں بھی سچے ثابت ہو چکے تھے لیکن اسلام سے تعصب و نفرت نے انھیں تنا اندھا کر دیا تھا کہ وہ کہنے لگے: ''یہ تمھارے بھتیجے کے جادو کا کرشمہ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔

اب زہیر بن ابی امیہ اور ہشام بن عمرو عامری اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ہتھیار بند ہو کر شعب میں پہنچے اور بنوہاشم کو اپنے ہمراہ مکہ میں لے آئے اور بنوہاشم و بنومطلب پھر سے مکہ میں رہنے لگے اور معاشرتی بائیکاٹ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

●●

پھر کچھ دن بعد ایک وفد ترتیب دیا گیا جس میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوالحکم عمرو بن ہشام، امیہ بن خلف، ابوسفیان بن حرب سمیت پچیس اشراف قریش شامل تھے۔ انھوں نے ابوطالب کے پاس پہنچ کر کہا:

''اے ابوطالب! ہمارے درمیان آپ کا جو مرتبہ و مقام ہے، آپ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ اب آپ جس مرض سے دوچار ہیں، وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ آپ کے بھتیجے کے ساتھ ہمارا جو نزاع ہے، آپ کو بخوبی معلوم ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ انھیں بلائیں اور ان کے بارے میں ہم سے کچھ عہد و پیمان لے لیں اور ہمارے بارے میں ان سے عہد و پیمان لیں۔ وہ ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دیں اور ہم انھیں ان کے دین پر، ہم انہیں کچھ نہ کہیں اور وہ ہمارے مذہب کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔''

ابوطالب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلا لیا۔

''بھتیجے! یہ تمھاری قوم کے سردار آئے ہیں تا کہ تمھارے درمیان کوئی عہد و پیمان ہو جائے کہ تم ان کے دین سے چھیڑ چھاڑ نہ کرو اور وہ تمھارے دین سے!''

یہ سن کر پیغمبرِ اسلام نے اپنے چچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''چچا جان! آپ کیوں نہیں انھیں اس بات کی دعوت دیتے جو ان کے حق میں سب سے بہتر ہے۔''

''بھتیجے! وہ کون سی بات ہے جس کی طرف آپ انھیں بلانا چاہتے ہیں۔'' ابوطالب نے پیغمبرِ اسلام سے پوچھا۔

''میں ایسی بات کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ جس کے یہ لوگ قائل ہو جائیں تو عرب کے بادشاہ بن جائیں اور عجم ان کے اطاعت گزار ہوں گے۔''

مشرکین قریش یہ سن کر حیران اور ساکت رہ گئے کہ صرف ایک بات ہے، جو اتنی مفید ہے۔

کچھ دیر تمام لوگ سوچ میں پڑ گئے اور بالآخر ابوالحکم نے کہا:

''اچھا بتاؤ بات کیا ہے؟''

بقیہ صفحہ نمبر 11 پر

سورج کی کرن نے کیا دیکھا؟

جاوید بسام

شام ڈھل چکی تھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ اس کی نارنجی ٹکیہ افق کے مغربی کنارے پر ٹکی دنیا کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ آسمان پر ایک بدلی پر ڈوبتے سورج کی کچھ کرنیں بھی چمک رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک کرن، سورج سے باتیں کرنے لگی۔ وہ بولی:

"سورج بابا! میں آج آپ کو اپنے تمام دن کی روداد سنانے کی اجازت چاہتی ہوں۔"

سورج بابا نے اسے شفیق نظروں سے دیکھا اور سر ہلا کر اجازت دی۔

کرن نے بولنا شروع کیا:

"بابا! میں آج کے دن کی سب سے پہلی کرن تھی۔ جونہی آپ نے مشرق سے سر باہر نکال، میں سب سے آگے بھاگی اور بلند پہاڑ پر موجود ایک عقاب کے گھونسلے سے ٹکرائی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سو رہا ہوگا۔ میں اسے جگانا چاہتی تھی، لیکن وہ پہلے ہی جاگ رہا تھا۔ اس کی زرد رنگ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھونسلے سے باہر آیا اور اپنی مضبوط چونچ سے پر سنوارنے لگا، پھر اپنے طاقتور بازو پھیلائے چٹان کی نکڑ پر آیا اور شکار کی تلاش میں اُڑ گیا۔

میں آگے بڑھی اور برگد کے درخت پر بلبل کے گھونسلے پر دستک دی، مگر گھونسلہ خالی تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ میں کچھ نیچے آئی تو دیکھا، بلبل پھولوں کے کنج میں بیٹھی اپنی سریلی آواز میں چہچہا رہی ہے۔

میں نے اپنا کام جاری رکھا اور آگے بڑھی تو راستے میں ایک چھتے سے جا ٹکرائی۔

میرا خیال تھا کہ شہد کی مکھیاں سو رہی ہوں گی۔ میں انھیں اٹھا کر کام پر بھیجنا چاہتی تھی، مگر میں نے دیکھا کہ چھتا خالی ہے۔ میں حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ کانوں میں بھن بھن کی آواز آئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو بہت ساری مکھیاں وادی میں کھلے پھولوں کا رس چوس کر چھتے کی طرف آتی نظر آئیں۔

میں نے کہا لو یہ بھی میرے آنے سے پہلے بیدار ہو چکی ہیں۔ خیر میں آگے بڑھی اور مرغیوں کے ایک دڑبے پر دستک دی، مگر وہاں بھی سب جاگ رہے تھے۔ مرغیاں کڑک رہی تھی، مرغے ککڑوں کوں اور چوزے چوں چوں کر رہے تھے۔

میں نے آگے اڑان بھری اور گھنی دُم والی لومڑی کے بھٹ میں جا گھسی، لیکن بھٹ خالی تھا۔ میں پریشانی سے باہر آئی تو اسے دور گھاس کے میدان میں شکار کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔

میں چلتی رہی اور ایک وادی میں اتر گئی۔ جہاں گاؤں کے باہر میں نے کسانوں کو کھیتوں میں کام کرتے، گوالوں کو باڑوں میں دودھ دوہتے اور باغبانوں کو باغوں میں نئے پودے لگاتے دیکھا۔ یہاں تک کہ کولھو کا بیل بھی اپنا کام شروع کر چکا تھا۔ پھر مجھے چھوٹے سے پہاڑی اسٹیشن پر ریل کھڑی نظر آئی۔ وہ بھی سفر کے لیے تیار تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے وسل دی اور چھک چھک کرتی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔

خیر اب میں گھروں کے درمیان آن پہنچی۔ وہاں بھی لوگ جاگ چکے تھے۔ گھروں سے کھٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چائے اور پراٹھے بننے کی خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں، پھر لوگ ناشتہ کر کے گھروں سے نکلنے لگے۔

کچھ لوگ دکانیں کھول رہے تھے۔ مجھے بہت سے ملازم سڑک پر جاتے نظر آئے۔ اُن کے ہاتھوں میں کھانے کے ٹفن تھے۔ سڑک پر سواریاں بھی چلنے لگی تھیں۔ پھیری والے بھی ٹھیلوں پر سامان سجائے گلیوں میں نکل آئے تھے اور آوازیں لگا رہے تھے۔ سب ایک نئے دن کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ میں آگے بڑھتی گئی۔

چلتے چلتے مجھے ایک بند کھڑکی نظر آئی۔ میں نے اس کے شیشے سے جھانکا تو وہاں ایک لڑکا سوتا ہوا نظر آیا۔ میں خوش ہوگئی۔ میں نے سوچا چلو اسے جگاتی ہوں، ورنہ مجھے ابھی تک کسی کو جگانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سب پہلے ہی اٹھ چکے تھے۔ اس بچے کا نام معاذ تھا۔ میں اسے جگانے کی کوشش کرنے لگی۔ میری شعاع شیشے میں سے گزر کر اس پر پڑ رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ سوتا رہا، پھر کلبلایا اور ہلکی سی آنکھ کھول کر مجھے دیکھا اور پھر کروٹ بدل کر سو گیا۔

میری ساری محنت بیکار گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں نہیں اٹھ رہا۔ سارا دن میں یہی سوچتی رہی۔ اب آپ سے اپنے سوال کا جواب جاننا چاہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر سورج کی کرن خاموش ہوگئی۔

بقیہ صفحہ نمبر 11 پر

آہ! کیا عالم ہوگا اس وقت مدینہ منورہ میں؟ دوپہر کا وقت تھا، شہر نبی سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا جب اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے محبوب نبی کو بھی اپنے پاس بلوالیا۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”آپ کی جدائی پر ایک درخت کا تنا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا، تو لوگو خود ہی بتاؤ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تو ہمارا کیا حال ہوا ہوگا!؟“

حضرت عثمان تو جیسے کچھ بول ہی نہ پاتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بھی سکتہ طاری تھا۔ حضرت عمر تو بے یقینی کے عالم میں ننگی تلوار لیے بپھرے کھڑے تھے۔ حضرت بلال صدمے کے مارے اذان ہی نہ دے پاتے تھے۔

اس موقع پر صرف اور صرف وہی اپنے ہوش وحواس قائم رکھے ہوئے تھے جن کے کندھوں پر اس امت کی ذمے داری آنے والی تھی۔ نبی کی زندگی میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے زیادہ کام آئے، ان کے بعد بھی وہی سب سے زیادہ کام آئے۔

وہ بھی تو بارہ ربیع الاول تھا جب رسول للہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس شہر میں آمد ہوئی تھی، جب خوشی سے پورا شہر چمک دمک کر جھوم اٹھا تھا۔ ایک یہ بارہ ربیع الاول تھا جب مدینہ منورہ میں سہ پہر کا وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے تاریک شب کا آخری پہر چل رہا ہو۔

صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو ہر چیز روشن ہوگئی تھی۔ گویا شہر کو ایک نور کی چادر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پردہ فرما گئے تو ہر چیز مہیب تاریکی میں ڈوب گئی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہ پاتے تھے، یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی اپنا ہاتھ آگے پھیلاتا تو وہ اسے واضح دیکھ نہ پاتا تھا۔ صحابہ نے یہ المناک رات آنکھوں میں کاٹی تھی۔ اگلے دن جب بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذان دینے کھڑے ہوئے اور اشھد ان محمدا رسول اللہ پر پہنچے تو ضبط کے سارے ٹوٹ گئے اور سب زار و قطار رونے لگے۔

یہ مسلمانوں کا مرکز تھا، ہیڈکوارٹر، جہاں سے قافلے روانہ ہوئے، اور یہ چھوٹی سی مسجد دنیا بھر میں بڑھ کر پھیل جانے والے مسلمانوں کا مرجع بن گئی۔

☆......☆

میرے پاس یہاں ریاض الجنہ میں الحمدللہ بہت وقت تھا۔ ایک تو کافی دیر تک مجھے اپنی قسمت پر ہی شک ہوتا رہا کہ واقعی میں اندر پہنچ بھی گیا ہوں یا کوئی خواب ہے۔

میں نے اپنے ساتھ بیٹھے بھائی سے بات چیت کی تو انھوں نے بتایا کہ ہمیں پہلے سے ہمارے ایک رشتے دار نے بتا دیا تھا کہ ریاض الجنہ میں عید پڑھنے کے لیے دروازہ سوا بارہ بجے کھلتا ہے۔

ابھی مجھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی یہاں کہ اچانک مجھے وہ نظر آ گیا۔

مجھے اس کا نام تو معلوم نہیں تھا مگر وہ اس سفر میں مجھے بار بار ملا تھا۔

☆......☆

میں ایک دن حرمِ مکی میں اس جگہ بیٹھا تھا جہاں امام صاحب آکر نماز پڑھاتے ہیں۔ اور

آثارِ نبوی ﷺ کے تعاقب میں ماضی کے اوراق پلٹتے مسافر کی ایمان افروز رودادِ سفر

اُن کے کوچے میں

محمد فضیل فاروق

(آخری قسط)

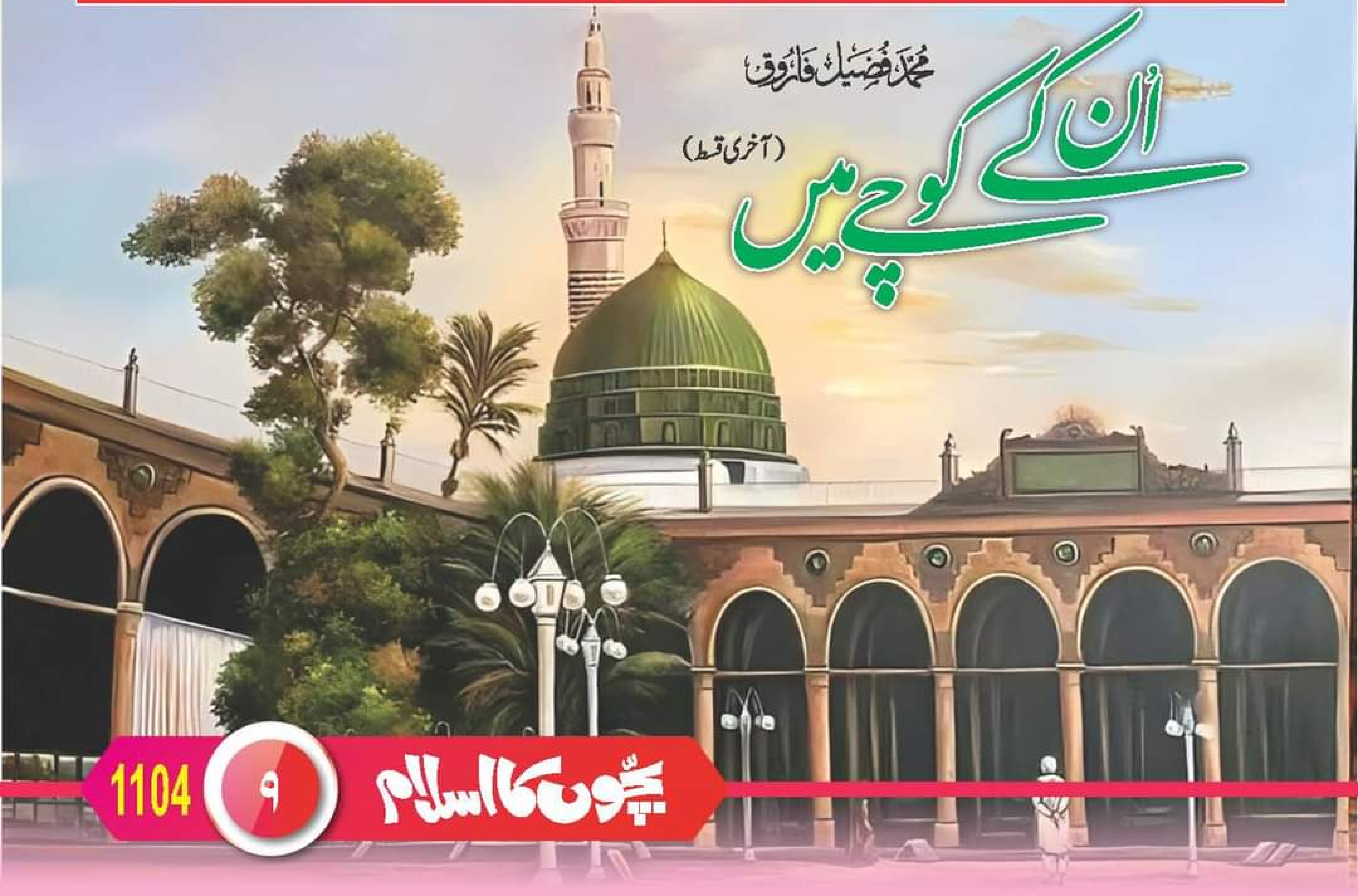

تراویح کے وقت تو تین چار ائمہ موجود ہوتے ہیں۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ یہاں جگہ پانے کے لیے عصر سے بھی پہلے سے بیٹھنا پڑتا تھا۔ تھوڑی دیر گزری تو مجھے اپنے ساتھ دو تین لڑکوں کی ذرا اونچی اونچی آوازیں سنائی دیں۔ میں متوجہ ہوا تو دیکھا برصغیر کے دو لڑکے ایک عربی لڑکے سے الجھے ہوئے تھے۔ میں قریب ہوا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی زبان جانتے نہ تھے، سو میں نے ترجمان کا کام کیا۔

عربی کہہ رہا تھا: ”یہ جگہ میری ہے، میں روزانہ یہاں بیٹھتا ہوں، اور اس پوری صف میں ہمارا دسترخوان لگتا ہے، اب یہ دونوں قبضہ جما کر بیٹھے ہیں۔“

وہ دونوں ہندوستان کے تھے، ان کا کہنا یہ تھا:

”بھائی! کیا انھوں نے یہ جگہ خرید رکھی ہے؟ پہلے آیئے پہلے پایئے والی بات ہے۔ ہم پہلے آئے تھے، ہم تو عصر سے بھی کافی دیر پہلے سے بیٹھے ہیں، اور یہاں سے تراویح پڑھ کر ہی جائیں گے۔“

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ دونوں بھی میری ہی طرح یہاں آئے ہیں۔ بہر حال میں نے انھیں کہا: ”بھائی! دیکھو یہ جگہ ایسی نہیں ہے جہاں لڑا جائے، بلکہ یہاں قربانیاں دی گئی ہیں صدیوں سے سو اپنی جگہ کی قربانی دے دو، اللہ پاک اس کا بہترین بدلہ دے گا۔“

انھیں تھوڑی دیر لگی مگر سمجھ گئے۔ یہ دونوں کزن تھے۔ مجھے عربوں کی طرح عربی بولتا دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے۔ اب انھیں کیا پتا کہ میں عربی زبان کا کیا حال کر رہا تھا۔ خیر ان دونوں کا تعلق ممبئی سے تھا۔ دونوں نے ابھی تازہ تازہ حفظ مکمل کیا تھا، جس کے انعام میں ان دونوں کے والد سب گھر والوں کے ساتھ عمرے پر آئے تھے۔ ان میں مجھے کافی حد تک اپنا عکس دکھتا تھا، نجانے کیوں۔ یہ دونوں کوئی سولہ سترہ سال کے قریب قریب کے رہے ہوں گے۔

اچھا اُس وقت ہوا یوں کہ مجھے بھی تھوڑی دیر بعد وہاں سے ہٹا دیا گیا، اور ہم تینوں ہی وہاں سے لٹکے چہروں کے ساتھ باہر چلے آئے تھے۔ اس کے بعد یہ مکہ میں مجھے کئی بار اور ملے۔ یہ ملاقاتیں اتفاقی ہی ہوتی تھیں، کبھی مطاف میں تو کبھی کہیں اور۔ ان میں سے ایک کے والد بڑے عالم تھے۔ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنو کے فاضل اور عربی زبان میں پی ایچ ڈی بھی، مگر ان سے کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ جب بھی ملتے یہی دونوں ملتے۔ ہمارے مدارس کے نصاب میں اب بھی عربی ادب کی معلم الانشاء کے مصنف دار العلوم ندوۃ العلما ہی کے فاضل ہیں، اور مشہور کتاب قصص النبیین کے مصنف مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی تو وہیں کے تھے۔

ہماری ان ملاقاتوں میں خوب اچھی گفتگو رہتی۔ دونوں ملک بھی موضوع بحث رہے۔ ان سے پڑوسی ملک کے احوال جانے۔ ان کا کہنا تھا کہ ممبئی میں مسلمان ایک تو کثرت سے ہیں اور ایک جتھے کی شکل میں بھی ہیں۔ یہاں کے شدت پسند تو دور، پولیس بھی ہم پر بھی فضول میں ہاتھ نہیں ڈالتی، ہاں البتہ جہاں تعداد میں مسلمان کم ہیں، وہاں وہ مشکل میں ہیں۔ چونکہ ان کا ابھی ابھی حفظ مکمل ہوا تھا اس لیے بات تراویح کی چل نکلی اور تراویح کے دوران عجیب عجیب ٹوکنے والوں کی بھی کہ لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں جن کا نہ سر ہو نہ پیر، مثلاً: ”مولی صاب! کیا بات ہے، آج گاڑی اٹک اٹک کر چل رہی تھی!“

یعنی حد ہے بھئی، ہم کیا ٹرین چلا رہے ہیں!؟

پھر طرح طرح کے لقمے دینے والے بھی چلے آتے ہیں، اسی پر اس نے یہ لطیفہ سنایا کہ ہمارے یہاں تو ایک بار انہی باتوں سے تنگ آ کر ایک حافظ سجدے میں اٹھ کر محراب والے دروازے سے فرار ہو گیا تھا۔

بات تو افسوس کی ہے مگر اس وقت ہنسی تھی کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

اب مدینہ منورہ میں میری پھر ان میں سے ایک سے ملاقات ہو گئی۔

اسے دیکھ کر میں خوشدلی سے بولا: ”ارے تم یہاں بھی پہنچ گئے؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولا: ”میں نے تو یہاں ریاض الجنہ میں الحمدللہ تراویح بھی کئی دن پڑھیں۔“

”واہ بھئی ماشاءاللہ!“

اگرچہ وہ اعلیٰ مقام بات چیت کا نہ تھا، مگر ہم تھے بھی تھوڑے کم عمر، اس لیے تھوڑے کم عقل بھی تھے۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ پہلے تہجد کی اذان ہوئی۔ وہ مقام جہاں اذان دی جاتی ہے بالکل ہمارے سامنے تھا۔ اسے مکبر یہ کہتے ہیں۔ ہمیں موذنین باقاعدہ اذان دیتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے موبائل نکال کر ویڈیو بنانا شروع کر دی۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں بھی بڑی منہ زور خواہش اٹھی۔ میں نے بھی موبائل نکال لیا، مگر پھر بروقت مسجد کے تقدس کا خیال آ گیا سو استغفار کرتے ہوئے دوبارہ جیب میں رکھ لیا، اور اس خوبصورت آواز سے لطف اندوز ہونے، ان مناظر کو آنکھوں کے کیمرے سے دل کی میموری میں ثبت کرنے لگا۔ سوچنے لگا کہ کیا ایمانی کیفیت ہوتی ہوگی ان موذنین کی جب یہ روزانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالکل سامنے گواہی دیتے ہوں گے:

اشھد ان محمدا رسول اللہ، اشھد ان محمدا رسول اللہ۔

پھر فجر کی اذان ہوئی۔ ل امام صاحب بھی وردی والوں کے گھیرے میں آتے دکھائی دیے۔ نماز حسب سابق (غالباً) شیخ حذیفی نے پڑھائی۔ ائمہ محراب رسول ہی میں کھڑے ہو کر نمازیں پڑھاتے ہیں جو ریاض الجنہ میں موجود ہے۔ شیخ نے روح کو گرما دینے والی تلاوت فرمائی۔ فجر کے تھوڑی دیر بعد ہی تمام موذنین چمکتے دمکتے سفید جبوں اور اس کے اوپر سفید ہی چوغوں میں عجب نور برسا رہے تھے۔ سب ایک گول دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ سنہری مائیکوں کے ذریعے شہر بھر میں لگے اسپیکرز میں منادی ہونے لگی۔ اللہ کی کبریائی، اس کی وحدانیت کا اعلان، اس کی حمد وثنا بیان ہوئی، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام پڑھا جانے لگا۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد اللہ اکبر کبیرا والحمد للہ کثیرا و سبحان اللہ بکرۃ و اصیلا۔ و صلی اللہ علی سیدنا محمد و علی الہ و صحبہ و سلم تسلیما کثیرا۔

ہر مؤذن باری باری تکبیر پڑھتے اور مائک برابر والے کو تھما دیتے، یوں ہم مختلف آوازوں، لہجوں اور اندازوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک بندہ اصل اور خالص عود لگانے لگا۔ یہ باقاعدہ سرکاری طور پر مسجد نبوی کا عملہ ہی تھا جو اگلی صفوف میں بیٹھے لوگوں کو اس خالص تحفے سے معطر کر رہا تھا۔ یہ اتنی کمال کی خوشبو تھی کہ دل و دماغ اندر تک معطر ہو گئے۔ وہ دو دن تک میں نے کپڑے پہنے رکھے تو اس کی خوشبو بالکل تازہ رہی، بلکہ کئی دھلائیوں کے بعد بھی مجھے اس کی مہک محسوس ہوتی رہی۔

پھر ذرا دیر گزری تو ایک بندہ بڑا سا سنہری بخوردان اٹھا کر سارے ریاض الجنہ کو مہکانے لگا۔ لوگوں نے اس کے اوپر اپنی ٹوپیاں رکھ کر خوشبوؤں سے بھر لیں، میں بھی ایسا کر کے آ گیا۔ آ کر میں نے اپنے ہندوستان کے دوست سے کہا کہ جاؤ

بھئی تم بھی بھرلو اپنی ٹوپی میں یہ کمال کی خوشبو! پہلے تو وہ ذرا جھجکا پھر کہنے لگا: ''یار! یہ کہیں بدعت تو نہیں؟''

میں مسکرادیا اور بولا: ''میں کب کہہ رہا ہوں کہ اسے عبادت یا ثواب کی نیت سے کرو، یا یہ کہ یہ کوئی بہت مبارک دھواں ہے جس سے کوئی انہونی ہوجائے گی!''

اس کی باچھیں کھل اٹھیں، کہنے لگا: ''واقعی دوست! بات تو تم بالکل درست کررہے ہو۔''

تھوڑی دیر بعد مدینہ منورہ کے گورنر اور شاہی خاندان کے لوگ آنا شروع ہوگئے، ریاض الجنہ میں تو چونکہ جگہ نہ تھی اس لیے ان لوگوں نے ذرا آگے وہاں صفیں بنائیں جہاں سے گزر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور سلام پیش کیا جاتا ہے، اور عید کی نماز بھی محراب رسول پر نہیں بلکہ ذرا آگے موجود محراب عثمانی پر ہونے والی تھی۔ اس محراب میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر امامت کروایا کرتے تھے۔

اندر خوشبوؤں کا تبادلہ، کھجوروں اور زم زم کے دور کے ساتھ تکبیر کی زمزمہ بار صدائیں واللہ عید کا اصل لطف دے رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنے دو سب سے قریبی رفقاء کے ساتھ یہیں موجود تھے، یہ احساس عید سے بڑھ کر خوش کن تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ مسجد کے باہر اس وقت رش کا کیا عالم ہوگا؟ بہت سوں کو جگہ نہ ملی ہوگی۔ بہت سوں کی فجر گئی ہوگی۔ بہت سے امام سے آگے کھڑے ہونے کی وجہ سے اپنی نمازوں سے ہی گئے ہوں گے۔ بہت سے تو بے چارے صفوں میں بیٹھے لوگوں کے کندھوں اور سروں کو ٹاپتے ہوئے ہجوم سے باہر نکلنے کی کوشش کررہے ہوں گے۔ اللہ ہم سب کی کوتاہیوں کو معاف فرمائیں۔ ہجوم ہی ایسا شدید ہوتا ہے کہ جان کنی کا عالم ہورہا ہوتا ہے۔

اچانک عید کی نماز کی منادی کرائی گئی۔ ''صلاۃ العید أثابکم اللہ''

عید کی نماز شیخ صلاح البدیر نے پڑھائی، اس کے بعد بہت ہی زبردست خطبہ ارشاد فرمایا۔ نماز و خطبے سے فارغ ہوئے تو سب سے پہلے ریاض الجنہ میں موجود لوگوں ہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری دینے کا موقع ملا۔ ہم نے رات بھی آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے در کے سامنے پڑاؤ ڈال کر گزاری تھی اور اب عید پر بھی سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور سلام پیش کررہے تھے الحمدللہ!

ان کی بارگاہ اقدس میں سلام باادب عرض کیا اور باب البقیع سے ہوتے ہوئے مسرور و سرشار باہر نکلے۔

باہر پھر شیخ صلاح البدیر سے ملاقات ہوگئی جنھوں نے ابھی ابھی عید پڑھائی تھی، لگتا ہے آج قسمت مجھ پر دل کھول کر مہربان تھی۔

میں مارے خوشی کے ہواؤں میں اڑتا چلا جارہا تھا...... جھومتا ہوا...... مدینے کی گلیوں میں اپنے گھر کی جانب بڑھتا جارہا تھا۔

یہ صبح مدینہ یہ شام مدینہ
بڑا لطف دیتا ہے شہر مدینہ

بقیہ: سورج کی کرن نے کیا دیکھا؟

سورج بابا کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے: ''ایسا کرو، آج میرے ساتھ واپس چلو، کل پھر اپنا کام شروع کرنا، تمھیں جواب مل جائے گا۔''

یہ کہہ کر سورج بابا نے مشرق پر آخری نظر ڈالی اور یہاں سے ڈوب مغرب میں طلوع ہوگئے۔

بدلی پر موجود کرنیں بھی آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگیں، لیکن اُس دن کی سب سے پہلی کرن سورج بابا کے ساتھ رخصت ہوگئی تھی۔

اگلے دن سورج نکلا تو پہلی کرن نے اپنا سفر پھر سے شروع کیا۔

وہ پہاڑ کی چوٹی پر، پھر درختوں کی پھننگ پر چمکی، اُس نے پرندوں کے گھونسلے پر دستک دی اور باڑوں میں ظاہر ہوئی۔ آخر وہ نیچے وادی میں پہنچی اور معاذ کی کھڑکی پر نظر ڈالی۔

کیا دیکھتی ہے کہ بستر خالی ہے۔

وہ حیرت سے گھر میں چلی آئی، جہاں اس نے دیکھا کہ معاذ اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا ناشتہ کررہا ہے۔

اس کی امی کہہ رہی تھیں: ''لو بیٹا! یہ دودھ کا گلاس بھی پی لو۔ میرا لال ایک دن کے بخار ہی سے کمزور ہوگیا۔ بیٹا! میں نے تمھارے استاد کو عرضی بھیج دی تھی۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ اور اپنا خیال رکھنا۔''

یہ کہہ کر انھوں نے معاذ کو پیار کیا۔

یہ دیکھ کر سورج کی پہلی کرن کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اُس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ کل معاذ کیوں سو رہا تھا؟ وہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اٹھانے اور زندگی کو رواں دواں کرنے کے لیے خوشی خوشی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

بقیہ: میر حجاز

''لا الٰہ الا اللہ کہو اور اللہ کے سوا جنھیں پوجتے ہو، انھیں چھوڑ دو۔''

یہ سن کر وہ تالیاں پیٹ پیٹ کر کہنے لگے: ''اے محمد! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ سب خداؤں کو ایک ہی خدا میں ڈھال لیں۔ واقعی تمھارا معاملہ بڑا عجیب ہے۔''

یہ کہنے کے بعد وہ آپس میں ایک دوسرے کو کہنے لگے: ''خدا کی قسم! یہ شخص ہماری بات ماننے کو تیار نہیں، لہٰذا چلو اور اپنے آبائی دین پر ڈٹ جاؤ۔ یہاں تک کہ اللہ خود ہی اس کے اور ہمارے درمیان فیصلہ فرمادے۔''

اس کے بعد انھوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔

ان کے چلے جانے کے بعد ابو طالب اپنے بھتیجے پر ناراض نہیں ہوئے بلکہ کہا:

''اللہ کی قسم بھتیجے! میں دیکھتا ہوں کہ تم نے ان سے کسی ناحق بات کا مطالبہ نہیں کیا۔''

اپنے چچا کی یہ بات سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں ان کے قبول اسلام کی اُمید پیدا ہوگئی، کہنے لگے:

''اے چچا! آپ یہ کلمہ کہیے، اس سے قیامت کے دن آپ کے لئے میری شفاعت جائز ہوجائے گی۔''

''اے میرے بھتیجے! اگر اس بات کا خوف نہ ہوتا کہ میرے مرنے کے بعد تمھیں اور تیرے بھائیوں کو قریش یہ طعنے دیں گے کہ میں نے موت کے ڈر سے کلمہ پڑھا ہے تو میں ضرور پڑھ لیتا اور میں یہ کلمہ صرف تمھیں خوش کرنے کے لیے پڑھتا۔'' (جاری ہے)

☆☆☆

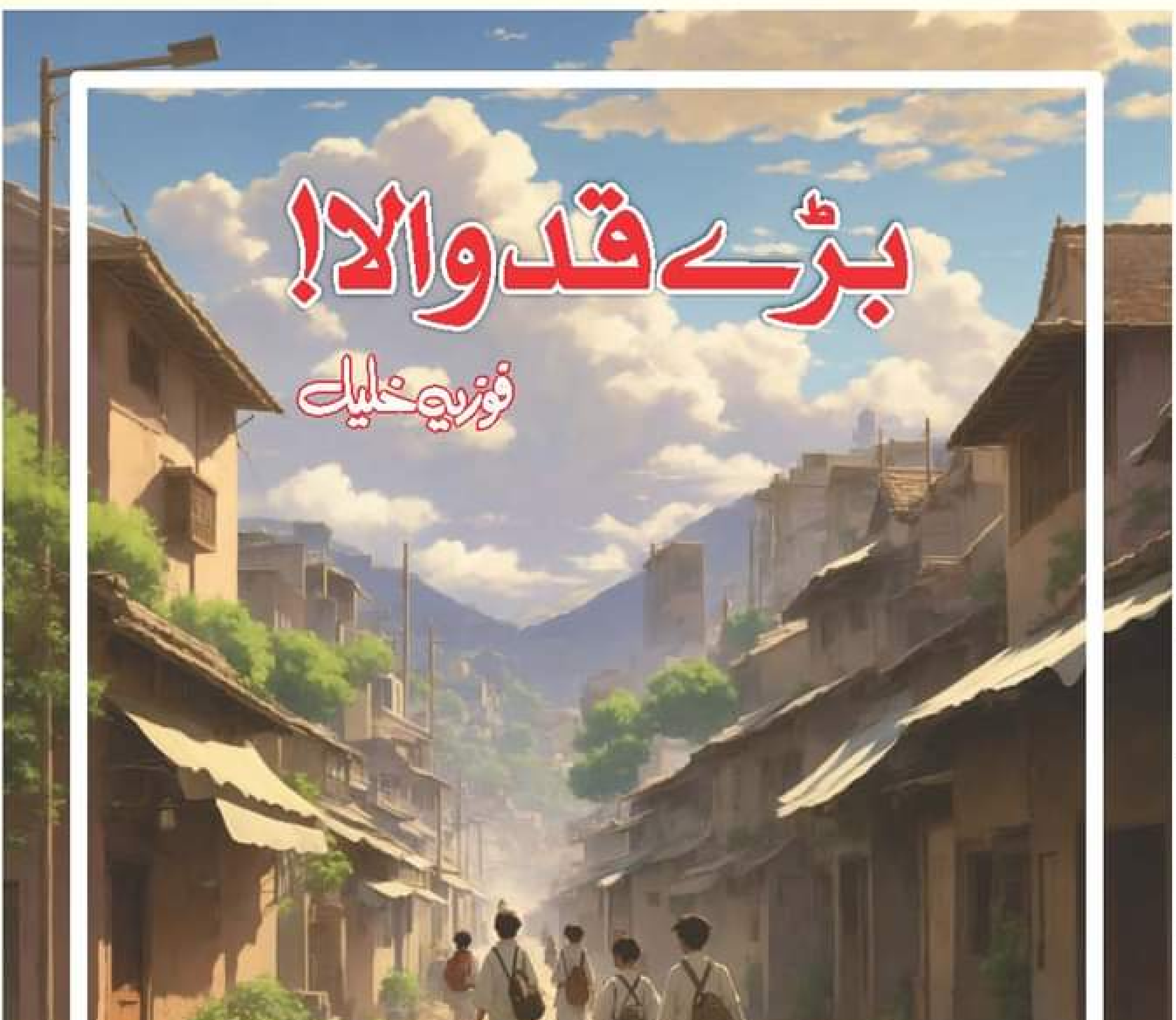

یہ کہانی میں نے جب بھی کسی کو سنائی، میں روئے بغیر کبھی اس کو مکمل نہ کر سکا۔ یادوں کا سلسلہ جڑتا ہے تو میں ایک قصبے میں خود کو پاتا ہوں۔

میرا تعلق پاکستان کے ایک چھوٹے سے قصبے سے ہے۔ میں وہیں پیدا ہوا، پلا بڑھا۔ میرے گھر میں صرف دو افراد تھے۔ ماں جی اور میں۔ نہ میرے والد تھے اور نہ ہی کوئی بہن بھائی۔

میں پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ ذہین بھی تھا اور محنتی بھی۔ میٹرک میں میری پورے ضلع میں اوّل پوزیشن آئی۔ میں نے انٹر میں داخلہ لے لیا۔ کالج کافی دور تھا مگر میں بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ کالج میں بھی میری پوزیشن آئی اور مجھے حکومت کی طرف سے اسکالرشپ ملا۔

لوگوں کا مشورہ تھا کہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہیے۔ لوگوں نے مجھے اتنے مشورے دیے کہ آخر کار میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلا آیا۔

اور ماں جی...... ہاں! ماں جی وہیں رہ گئیں، قصبے میں اکیلی۔

وقتِ رخصت ماں جی نے کہا تھا:

”پتر سلیم! جب تو پڑھ لکھ کر، بڑا آدمی بن کر لوٹے گا تو میں پورے قصبے والوں کی دعوت کروں گی۔“

انھوں نے گلے لگا کر، پیشانی پر پیار کر کے مجھے رخصت کر دیا۔

تقریباً سارے ہی قصبے والے مجھ سے ملنے آئے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا:

”سلیم ڈاکٹر بن کر لوٹے گا تو یہاں بڑا سا اسپتال بنائے گا۔“

کوئی کہتا: ”سلیم انجینئر بن کر آئے گا تو قصبے میں نئی نئی عمارتیں بنائے گا۔“

انھی میں میرا ہم جماعت بھی تھا ناصر۔

ناصر قصبے میں میری جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ بس آٹھویں جماعت تک پڑھ سکا تھا۔ پڑھنے میں کم زور جو تھا۔ اس کا دماغ اتنا تیز نہ تھا۔ یاد کرتا تھا تو جلد بھول جاتا تھا۔ وہ کوشش کرتا تھا مگر عام طور پر فیل ہو جاتا تھا۔

دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح ناصر بھی مجھ سے گلے ملا۔

اس نے عقیدت سے میرے ہاتھ چومے اور بولا:

”سلیم بابو! باہر جا کر ہم لوگوں کو بھول نہ جانا۔“

مجھے یاد ہے میں دل میں ہنسا تھا۔ ناصر ایک مکینک بن رہا تھا۔

”بھلا ناصر میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ اسے یاد رکھا جائے۔“

اور پھر میں امریکا چلا آیا۔

میرے دوست شیدا، کالو اور شرفو سب وہیں رہ گئے۔ یادوں کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔

پسِ منظر سے آواز ابھری تھی اور میں حال میں لوٹ آیا۔

”پاپا! کل مدرز ڈے ہے ناں؟ میں مما کو کارڈ بھیجوں گا اور گلدستہ بھی۔“

میرا آٹھ سالہ بیٹا خوب صورت سا کارڈ بنا کر اس میں رنگ بھرنے میں مصروف تھا۔

”ٹھیک ہے ناں!؟“ اس نے پوچھا تھا۔

وہ بہت دل لگا کر کارڈ میں رنگ بھر رہا تھا۔ اس کی تمام انگلیاں واٹر کلر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کارڈ کے اوپر اس نے لکھا تھا: I Love you mama

رنگ بھرتے بھرتے اس نے اپنا چہرہ اٹھا کر پوچھا:

”پاپا! آپ بھی اپنی ماما کو مدرز ڈے پر کارڈ بھیجتے ہیں ناں! آپ نے بتایا تھا ناں کہ آپ کی مما بہت دور رہتی ہیں، پاکستان میں، وہ میری گرینڈ ماما ہیں۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ ”وہ میری دادو ہیں۔ آپ جب اپنی مما کو کارڈ بھیجیں گے تو اس میں لکھیے گا کہ میں انھیں مس کرتا ہوں۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ دوبارہ سے رنگ بھرنے لگا، اور میں پھر ماضی میں ڈوب گیا، جہاں سے ابھرا تھا۔

مجھے امریکا آئے دس سال ہو چکے تھے۔ میں نے یہاں تعلیم مکمل کی اور پھر کیرولین سے میری شادی ہو گئی۔

کیرولین میرے ساتھ ہارورڈ یونی ورسٹی میں پڑھتی تھی۔

امریکا کی مصروف زندگی نے مجھے موقع ہی نہ دیا کہ میں کبھی پاکستان جاتا۔ شروع میں چند مرتبہ میں نے خط لکھے، فون کیے، پیسے بھی بھیجے مگر یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا۔

مجھے گویا یاد ہی نہ رہا کہ میں کہاں سے آیا تھا؟

کیرولین بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی اور پھر ابراہیم کی پیدائش کے بعد ہماری فیملی مکمل ہوگئی۔

اپنے گھر اور بچے سے کیرولین کو گہری وابستگی تھی۔ وہ ابراہیم کی پڑھائی لکھائی اور ہر کھیل میں دلچسپی لیتی تھی۔

اور پھر ایک رات وہ اپنی گاڑی پر گھر واپس آرہی تھی، ابراہیم اس کے ساتھ تھا کہ ایک خوف ناک حادثہ ہوا اور کیرولین مرگئی۔

گاڑی مکمل تباہ ہوگئی تھی مگر ابراہیم کرشماتی طور پر بچ گیا تھا۔

ابراہیم اپنی ماں کے بے حد قریب تھا۔ مجھے اسے سنبھالنے میں کافی وقت لگا۔

پسِ منظر سے آواز ابھری تو ایک بار پھر خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

ابراہیم کا کارڈ مکمل ہوچکا تھا۔

''پاپا! کل ہم مما کی قبر پر جائیں گے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''پاپا! آپ اپنی مما کو یاد کرتے ہیں؟ میں بھی اپنی مما کو بہت یاد کرتا ہوں۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکے تھے، جنھیں اس نے کمال مہارت سے پونچھ لیا تھا اور پھر وہ مضبوط چٹان بن کر کھڑا ہوگیا۔

''چلیے پاپا! اب ڈنر کا وقت ہوگیا۔ دادو کا کارڈ ہم رات کو بنائیں گے۔''

وہ بولا اور میز پر پڑی اپنی بکھری چیزیں سمیٹنے لگا۔

ہاسٹل کی زندگی اور کیرولین کی تربیت نے اس میں بہت سلیقہ اور نظم وضبط پیدا کردیا تھا۔

میں کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانکنے لگا۔

باہر برف گر رہی تھی۔ ہر طرف سفید ہی سفید برف۔

''آپ اپنی مما کو یاد کرتے ہیں ناں! میں بھی اپنی مما کو بہت یاد کرتا ہوں۔''

میرے ذہن میں ابراہیم کے جملے گونجے۔

''کیا واقعی میں اپنی ماں کو یاد کرتا ہوں؟''

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''نہیں......!'' میرے ضمیر نے مجھے جواب دیا۔

''دس برسوں میں، میں نے کبھی انھیں یاد نہیں کیا۔''

ابرام کی گفتگو نے میری سوچوں کو ایک نیا رخ دے دیا۔ وہ اپنے ہاسٹل گیا تو میں نے پاکستان کا پروگرام بنالیا۔

''ماں جی پتا نہیں کیسی ہوں گی؟ ان کی ضروریات کا کون خیال رکھتا ہوگا؟ میں نے تو برسوں سے انھیں ایک خط تک نہ لکھا تھا۔'' میں سوچ رہا تھا۔

پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے مٹی کی محبت نے آگھیرا۔ یہ وہ محبت تھی جس کا قرض اتارنے کے لیے میں باہر گیا تھا اور پھر سب کچھ بھول بھال گیا۔

اپنی بستی پہنچ کر مجھے سب کچھ یاد آنے لگا۔ میرا اسکول، مدرسہ، میرے سنگی ساتھی وہ گلیاں، وہ باغ۔ سب کچھ کم وبیش ویسا ہی تھا، بہت کم تبدیلیوں کے ساتھ۔

میں نے کوئی سواری لینے کی بجائے پیدل چلنا مناسب خیال کیا۔

ایک رکشہ میرے پاس آکر رکا: ''شہری بابو! رکشہ لینا ہے۔''

''نہیں جناب......آپ کا شکریہ!'' میں پیدل چلتا رہا۔

وہ نہر، وہ پگڈنڈیاں، وہ آم کے درخت، ایک موڑ مڑا تو آگے میرا اسکول تھا۔

وہ اسکول جہاں میں نے اپنی زندگی کے دس سال گزارے تھے۔ شام ہورہی تھی۔ اسکول خالی پڑا تھا۔ باہر کا گیٹ آدھ کھلا تھا۔ کمرۂ جماعت اور راہ داریاں نظر آرہی تھیں میں عقیدت سے اسکول کی دیواروں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ایک ایک کر کے مجھے اپنے شفیق اساتذہ یاد آنے لگے۔ پتا نہیں وہ سب اب کہاں ہوں گے؟

اندازے سے میں نے دو گلیاں عبور کیں اور چھوٹے سے مکان کے آگے آکھڑا ہوا۔

ہاں یہ وہی گھر تھا، بالکل وہی...... جہاں سے دس سال قبل میں رخصت ہوا تھا۔ ماں جی نے مجھے گلے لگا کر اور پیشانی پر پیار کر کے رخصت کیا تھا اور کہا تھا:

''پتر سلیم! جب تو پڑھ لکھ کر، بڑا آدمی بن کر لوٹے گا تو میں پورے قصبے والوں کی دعوت کروں گی۔''

مگر!!! وہ کل تو کبھی آئی ہی نہیں۔ ہاں...... وہ کل کبھی نہ آئی۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ اٹھایا، مگر دروازہ تو کھلا ہوا تھا میں کھنکھار کر اندر داخل ہوا۔

''پتر سلیم!'' مجھے کہیں اندر سے ایک بوڑھی آواز سنائی دی۔

میں بھاگ کر اندر کی طرف لپکا۔ صحن سے کمرے تک کا فاصلہ مجھے طویل تر محسوس ہوا۔

ماں جی ایک چار پائی پر لیٹی تھیں۔ بیمار، کم زور، چہرے پر جھریوں کا جال۔

مجھے دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں میں بے تحاشا خوشی اور بے یقینی لہرائی۔

''قصبے والے کہتے تھے۔ پتر سلیم اب کبھی نہیں آئے گا مگر مجھے یقین تھا تو ایک دن ضرور آئے گا۔''

انھوں نے اٹھنے کی کوشش کی اور ڈگمگا گئیں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔

میں روتے ہوئے ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''پتر سلیم!'' انھوں نے اپنے جھریوں زدہ ہاتھ میرے چہرے پر پھیرے۔

''میں آپ کا پتر نہیں ہوں ماں جی! میں تو بہت برا ہوں، بہت برا۔''

میں نے ان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

''اِن ہاتھوں کا، اس وطن کی مٹی کا بہت مقروض ہوں میں۔''

میرے لب پھڑ پھڑائے۔

''اب تُو آگیا پتر سلیم! تجھے دیکھنے کے لیے ہی اب تک

مرا گھر ہے مرا ملک

اثر جونپوری

ایمان کی خوشبو سے معطر ہے مرا ملک
اسلام کی کرنوں سے منور ہے مرا ملک
دنیا میں ممالک کی تو بہتات ہے لیکن
میرے لیے ہر ملک سے بہتر ہے مرا ملک
روشن ہے زمینوں پہ مرے ملک کا پرچم
افلاکِ جہاں کے لیے خاور ہے مرا ملک
ظاہر ہے فراوانی وسائل کی بہر سمت
اللہ کے انعام کا مظہر ہے مرا ملک
اے کاش ملے سودی غلاظت سے طہارت
اے کاش میں بھی کہہ سکوں اطہر ہے مرا ملک
ہے ٹکنالوجی کل کی طرح روبہ ترقی
کمتر ہے عدو آج بھی برتر ہے مرا ملک
سلجھے ہوئے افراد وفادار محافظ
شریں ہے مری قوم تو خوشتر ہے مرا ملک
پنجاب ہے گلشن تو اثر سندھ ہے مسکن
کشمیر ہے آنگن تو مرا گھر ہے مرا ملک

جی رہی تھی، اب میں سکون سے مر سکوں گی۔'' ماں جی کہہ رہی تھیں۔

''میں کیسا بیٹا ہوں ماں جی! دس سال آپ نے مجھے یاد کیا؟'' میری ہچکی بندھ گئی تھی۔

''تیرے خطوں نے میرے جینے کی ڈور باندھ رکھی تھی۔ وہی خط تو تھے جنھیں آنکھوں سے لگاتی تھی اور پھر کچھ دن مزید جی لیتی تھی۔''

''خط......؟'' میں نے دل میں سوچا۔

''پتر سلیم! تو بھوکا ہوگا، چل پہلے کچھ کھا لے، میں کیسی ماں ہوں، تجھ سے کھانے کا تو پوچھا ہی نہیں۔''

ماں کا ظرف کتنا بڑا ہوتا ہے۔ ''اے میرے مولا! تو نے ماں کا ظرف کیسا بنایا ہے؟ نہ کوئی شکوہ، نہ شکایت۔''

ماں جی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ وہ بخار میں تپ رہی تھیں۔ میں ساری رات ان کے سرہانے کچی زمین پر بیٹھا رہا۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو بھگو کر ماتھے پر رکھتا رہا۔

چند گھنٹے...... ہاں صرف چند گھنٹے! میں نے اُن کے ساتھ گزارے بس! اور پھر وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔

وہ اپنے پتر سلیم کی راہ تک رہی تھیں۔ صرف پتر سلیم سے ملنے کے لیے ہی زندہ تھیں۔

بعد میں کیا ہوا؟ مجھے کچھ خاص یاد نہیں۔ جنازے میں، تدفین میں سارا ہی قصبہ شریک تھا۔ میں بس ایک کونے میں بیٹھ کر روتا رہا تھا، اور روتے روتے بے ہوش ہو گیا تھا۔

کچھ دن بعد میں بے خیالی میں ماں جی کی الماریاں کھول رہا تھا۔ ان کے دوپٹے نکال کر ان کی خوشبو دل میں اتار رہا تھا۔ وہ دوپٹے جن میں ممتا کی مہک تھی کہ اچانک مجھ کو بہت سارے خطوط نظر آئے۔

ترتیب سے رکھے ہوئے یہ وہی خطوط تھے جن کا ماں جی ذکر کر رہی تھیں۔

''یہ کس نے لکھے؟'' تجسس نے سر اٹھایا۔ میں نے خط کھولا۔

خط ماں جی کے نام تھا اور بہت پیار سے لکھا گیا تھا۔ آخر میں لکھا تھا:

''آپ کا پیارا سلیم پتر، جو آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ میں جلد ہی آؤں گا۔''

خط کو میں نے بار بار پڑھا اور پھر اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ وہ ناصر کی لکھائی تھی۔

میرا ہم جماعت ناصر، جو پڑھنے میں کم زور تھا، اس کا دماغ بھی تیز نہ تھا۔ وہ 'ذ' کو 'ض' اور 'س' کو 'ث' اور 'ت' کو 'ط' لکھتا تھا اور ہم سب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

وہ ایک چھوٹے سے قصبے میں مکینک تھا، محض چند ہزار کمانے والا!

اور میں دنیا کی سب سے بہترین یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل ایک نامی گرامی ڈاکٹر تھا۔

میری ماں جی پڑھی لکھی خاتون نہ تھیں۔ ناصر جو خطوط لاتا تھا خدا جانے کس سے پڑھواتی تھیں۔ ناصر ہی سے یا کسی اور سے۔

میں گھر سے باہر نکل آیا۔ میرے قدم ناصر کی دکان کی طرف اٹھ رہے تھے۔

وہ مجھے دور ہی سے دکھائی دے گیا۔ میلے کچیلے کپڑے، تیل اور گریس میں اٹے ہوئے۔ بال بھی گرد آلود مگر اس کا من کتنا اجلا تھا! میرا سفید لباس بے داغ اور بے شکن تھا مگر میرا من!!!

ناصر گاہکوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دور سے دیکھ لیا تھا۔ میں قریب گیا اور اس کے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیے۔

ناصر نے گھبرا کر اپنے میلے ہاتھ اور میلا حلیہ دیکھا پھر میری آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھے۔

زندگی میں کچھ لمحے ایسے آتے ہیں جب ہم کچرے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت دل یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا ہم پر اپنا کچرا پھینکے، تب دل یہ چاہتا ہے کہ لوگ ہم پر تھوکیں، ہم کو برا بھلا کہیں۔

مجھے لگا ناصر کا قد بہت بڑا ہو گیا ہو اور میرا قد بہت چھوٹا۔ یوں لگا کہ اگر میں مزید وہاں کھڑا رہا تو کچلا جاؤں گا۔

میں دکان سے باہر چلا آیا۔

ایک غریب مکینک کی کہانی جب میں نے اپنے بیٹے ابراہیم کو سنائی تو پھوٹ پھوٹ کر روئے بغیر میں یہ کہانی کبھی مکمل نہ کر سکا۔ ☆☆☆

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ!

☆ شمارہ ۱۰۹۳ شمارہ اچھا تھا۔ دستک کی جگہ لاڈلا مضمون تھا۔ دستک کی کمی محسوس ہوئی۔ بنات قاضی شمس الدین، مانسہرہ کا مضمون مزے کا لگا۔ پروفیسر محمد اسلم بیگ کا مضمون پڑھ کر بہت فائدہ ہوا۔ 'دال میں کالا' کہانی اچھی تھی۔ 'میر حجاز' سلسلہ بہت ہی اچھا ہے۔ شہزادے کا کمال زبردست تھی۔ ''پرانی زندگی'' کہانی کے کیا کہنے۔ ان کے کوچے میں سفرنامہ اچھا ہے پڑھ کر دل تڑپ جاتا ہے۔ 'آم کی کہانی' بہت ہی اچھی لگی۔ آمنے کی جگہ پر آئے تو سامنے غائب پایا۔ آج کل بنت مولوی شبیر احمد وہاڑی نظر نہیں آ رہی ان کے خط یا مضمون کو دیکھ کر بہت ہی خوشی محسوس ہوتی ہے جیسے اپنی بہن کا خط آ گیا ہو۔ چاچو آپ سے پوچھنا تھا کہ کبھی آپ نے کبیر والا تشریف لائے ہیں۔

(حور عینا بنت محمد الیاس۔ کبیر والا)

ج: ابھی تک تو نہیں۔ شہرہ بہت سنا ہے، خصوصاً آپ کے جامعہ کا۔

☆ شمارہ ۱۰۹۴ کا سرورق دیکھ کر روہی کے صحرا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ 'مختصر پر اثر' سلسلے نے دل کو چھو لیا۔ شازیہ نور کی تحریر 'اندر کی باتیں' مزاح سے بھرپور تھی۔ 'نتیجہ کیا نکلا' تحریر بہت اچھی لگی۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ اس طرح چلتا رہے گا۔ 'میر حجاز' تو پھر بے مثال ہی ہے اس نے تو سوئے ہوئے دلوں کو جگا دیا ہے۔ 'ایک کہانی بڑی نرالی' ہے تو بڑے مزے کی لیکن بچوں کی باتیں کرنے کی وجہ سے خاص مزہ نہیں آیا۔ خوشی ہوئی کہ اس شمارے کے آخری ورق کو ضائع ہونے سے بچا لیا ہے اور ایک اور لکھاری کو اس میں جگہ مل گئی ہے۔ امید ہے کہ آخری ورق کو ضائع ہونے سے بچاتے رہیں گے۔ (ثقلین معاویہ۔ لودھراں)

ج: بچوں کی کہانی میں بچے ہی باتیں کریں گے ناں! ویسے آخری صفحے کو ضائع نہ کرنے سے شاید آپ کا اشارہ اشتہار کی طرف ہے، اشتہار سے صفحہ ضائع نہیں ہوتا بلکہ وہ پورا شمارہ تندرست رہتا ہے۔

☆ شمارہ ۱۰۹۷ کا سرورق کسی سرسبز و شاداب علاقے کی نمائندگی کر رہا ہے جہاں کے امیر کبیر طلبہ کی اکثریت پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ان پڑھ طلبہ کہلانے کی مستحق ہے۔ دستک میں آنجناب نے ایک اہم معاشرتی پہلو کی طرف متوجہ کیا، بہت شکریہ۔ 'مختصر پر اثر' کئی دنوں بعد نظر آئی، جبکہ 'آیئے دین سیکھیے' بھی آج کل غائب ہے۔ 'ان پڑھ طلبہ' پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ محترمہ بنت شکیل اختر اس مرتبہ ایک منفرد کہانی کے ساتھ تشریف لائیں۔ یکا یک ہمیں ثمرا جلاس والی شازیہ نور آپی اور دیگر لکھاری حضرات یاد آ گئے جو پھلوں کے نرغے میں پھنس جاتے ہیں۔ آمنے سامنے پڑھ کر اداسی کی لہر دوڑ گئی۔ محمد سفیان اکرم اور مریم ربانی کے حالات پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آسانی کا معاملہ فرمائیں۔ (رملہ فرحان۔ حیدر آباد)

ج: آمین ثم آمین۔

☆ شمارہ ۱۰۹۵ کا سرورق دیکھ کر ہمیں لگا کہ فاتحین سیریز ہے مگر یہ ایک کہانی تھی۔ علی اکمل تصور کی یہ کہانی پڑھ کر ہم نے بھی ہجرت کے درد کو محسوس کیا۔ اکثر ہم بھی اپنے نانا جان سے ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد کے واقعات سنتے رہتے ہیں اور ان کا غم چہرے سے چھلکتا ہے۔ 'میر حجاز' کا کتابی شکل میں آنے کا انتظار ہے۔ 'ان کے کوچے میں' سعودی عرب والوں کی اکرام مسلم پر متاثر ہوئے۔ 'جو شخص چاہے' ابوبکر عباسی کہانی بھی لکھنے لگے۔ کہانی سے ہم متفق ہیں۔ 'ایک کہانی بڑی نرالی' واقعی بڑی ہی نرالی تھی۔ بنت البحر نظر نہیں آرہیں خطوط میں۔ عتیق احمد صدیقی، ساجدہ غلام محمد اور سید بلال پاشا اگر لکھنا بھول گئے ہیں تو ایک بار پھر خطوط سے ابتدا کیجیے نا! (طیبہ راؤ۔ علی پور، مظفر گڑھ)

ج: ہاں بالکل ٹھیک بات ہے، کم از کم خط ہی لکھ دیں۔

☆ شمارہ ۱۰۹۵ میں سب سے بہترین تحریر 'گردیپ سنگھ' تھی۔ بہت زبردست اور کمال کی کہانی تھی۔ 'وقت لگتا ہے' کہانی ہم میں لکھنے کی ایک نئی ہمت پیدا کر گئی۔ 'جو شخص چاہے' کہ زبردست تھی۔ معلوم ہوا کہ کبھی بھی کسی کے لیے اذیت کا سبب نہیں بنا چاہیے، خود تھوڑی سی مشقت برداشت کر لیں مگر دوسروں کو تکلیف دینے سے بچیں۔ شمارہ ۱۰۹۶ کی سب سے بہترین تحریر 'سب سے پیاری چیز' تھی۔ 'ایک کہانی بڑی نرالی' اپنے اختتام کے ساتھ بہت اچھا سبق سکھا گئی۔ بے شک محنت اور لگن ہو تو انسان بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ 'آپ کتنے پانی میں ہیں' ان میں سے مجھے چار سوالوں کے جواب آتے تھے۔ آخری سوال کا جواب نہ آتا تھا اور نہ ہی ملا۔ 'آمنے سامنے' جوابات کے ساتھ بہت اچھا لگتا ہے۔ (بنت ملک اشرف۔ گڑھا موڑ)

ج: اگلے صفحے تو جواب مل گیا ہوگا ناں؟

☆ ہمیں 'بچوں کا اسلام' بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ کی 'دستک' نے آج کل دھوم مچائی ہوئی ہے۔ تصوراتی سفر سچ مچ شاندار سیر کروا رہا ہے۔ جب رسالہ آتا ہے سب سے پہلے 'آمنے سامنے' کو دیکھتے ہیں۔ شمارہ ۱۰۹۳ پڑھا۔ 'دال میں کالا' فرزانہ چیمہ کی کہانی بہت ہی زبردست تھی۔ 'شہزادے کا کمال' پڑھ کر دل میں عہد کیا کہ میں بھی ان شاء اللہ تعالیٰ قرآن پاک حفظ کروں گی۔ احمد حاطب صدیقی کی نظم ''استاد محترم کو میرا اسلام کہنا'' واقعی زبردست تھی۔ 'ان کے کوچے میں' پڑھی تو دل کعبے کے طواف کے لیے تڑپنے لگا۔ (حور عینا، حفصہ صفدر، ماہ نور قاسم، عائشہ قاسم۔ کبیر والا)

ج: اللہ تعالیٰ طواف کعبہ جلد نصیب کرے، آمین!

☆ بچپن ہی سے نونہال پڑھ کر بڑا ہوا اور اس کے علاوہ کوئی رسالہ پڑھنے کا دل نہیں کرتا تھا لیکن جب ایک دن بک انسٹال پر رکھے بچوں کا اسلام پر نظر پڑی تو تب سے اسی کے ہو کر رہ گئے۔ سچ میں ہمارے بچوں کا اسلام میں دوسرے رسائل کی نسبت زیادہ اچھی، مزیدار، دلچسپ اور اخلاق کو سنوارنے والی کہانیاں ہوتی ہیں جنھیں بچوں کے ساتھ بڑے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

(محمد عمیر جمیل منگھوپیر کراچی)

ج: جی ہاں بڑے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ویسے آپ بچوں میں سے ہیں یا بڑوں میں آتے ہیں؟

☆ دستک میں مدیر محترم رسوم و رواج کی بری عادت سے نالاں نظر آئے۔ ''خزانے کی چابی'' بہت خوبصورت تحریر۔ ''اعتراف'' میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے اگر ہم چاہیں تو۔ ''کالے کمبل کی کہانی'' لالچ بری بلا پر عمدہ کہانی رہی۔ ''موتی چور کے لڈو'' زندگی گزارنے کا بہترین فلسفہ بتاتی نظر آئی۔ ارے واہ بچوں کا اسلام کا شمارہ نمبر گیارہ سو، ابھی کل ہی بات لگتی ہے کہ جب ہمارے ہاتھوں میں بچوں کے ادب کا طویل ترین شمارہ الف نمبر تھا اور اب مزید سو شمارے بھی گزر گئے۔ اللہ اس رسالے کو رہتی دنیا تک بچوں کی تربیت کا ذریعہ بنائے رکھے، آمین۔ تعویذ محبت حافظ صاحب کی ختم نبوت پر ایک اور دلکش تحریر رہی۔ بہت عمدہ کام کر رہے ہیں اس حوالے سے حافظ صاحب۔ 'ننکو نے باغ کا کیکر' تمثیلی انداز میں لکھی گئی دلچسپ تحریر رہی۔ 'کرو مہربانی تم اہل زمیں پر' ایک خوبصورت تحریر رہی۔ شاداب نگر کے لوگوں نے بہت عمدہ سبق دیا۔ ''کہانی ایک سفر کی'' پر پروفیسر صاحب کا تبصرہ بہت زبردست رہا۔ مجھ جیسے قارئین جو یہ کتاب پڑھ چکے ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ بہت کم

سفرنامے اس طرح کے ہوتے ہیں جو قاری کو اپنے ساتھ بہائے لے جاتے ہیں۔ یہ سفرنامہ بھی انھی میں سے ایک ہے۔ (محمد دانیال حسن چغتائی کہروڑ پکا ضلع لودھراں)

ج: بہت شکریہ۔ ارادہ ہے کہ جلد ہی ایک اور سفرنامہ شروع کیا جائے۔

☆ شمارہ ۱۰۹۶ میں 'تصوراتی روداد' خوش اسلوبی سے اختتام پذیر ہوئی۔ بہت ہی مزا آیا۔ 'سب سے پیاری چیز' بہت عمدہ لگی۔ محترم اثر جون پوری کی نظم ہمیشہ کی طرح بہت اچھی رہی۔ محمد فضیل فاروق بہت عمدگی سے اپنا سفرنامہ بیان کر رہے ہیں۔ سیرت کے واقعات سفرنامے کو دلکش بنا رہے ہیں۔ 'زندہ پہیلی' سائنس سمجھاتی تحریر تھی۔ ہمارے علم میں اضافہ ہوا پڑھ کر۔ 'آمنے سامنے' میں خطوط بہت اچھے لگے، کیونکہ ایک خط میں ہمارا تذکرہ تھا۔ اللہ ان کو خوش رکھے جنھوں نے ہمیں یاد کیا۔

(بنت البحر۔ ٹنڈو آدم)

ج: اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے۔

☆ شمارہ ۱۰۹۵ کے سرورق پر ایک آدمی ایک بزرگ پر تلوار اٹھائے ہوا تھا۔ دار القرآن والحدیث سے معافی کا درس لے کر دستک کے ذریعے مدیر بھیا کے ساتھ شریک سفر ہے۔ خوب مزہ آیا۔ 'ہزار ہفتوں کے بھیا اور بہنا' جویریہ فاروقی نے ہمارے بھیا بہنا پر بات کی۔ عزت نفس بہت خوب تھی قابل رشک ہیں ایسے اساتذہ۔ 'گردیپ سنگھ' کتنا ظالم تھا شہداء کی قربانیاں یاد آگئیں۔ 'وقت لگتا ہے' کچھ پانے کے لیے کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ ''مل کر بولو پاکستان'' گنگنا کر پڑھی۔ 'ان کے کوچے میں' گویا ہم بھی فضیل فاروق کے ساتھ شریک سفر ہیں۔ مدیر محترم آخر اگلا سالنامہ کب آئے گا؟ شدت سے انتظار ہے۔ (سدیرہ بنت امیر بخش۔ لیاری، کراچی)

ج: اللہ رب العزت ہی جانیں، ابھی تک دور دور تک کوئی آثار نہیں ہیں۔

☆ یہ میرا پہلا خط ہے۔ میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں خط لکھوں۔ میرے پاس صرف دو رسالے ہیں بچوں کا اسلام کے۔ یہ بہت پرانے رسالے ہیں۔ مجھے 'جذباتی فیصلہ' بہت اچھا لگا۔ اس میں بہت سا سبق سیکھنے کو ملا۔ 'قصہ ایک سیب کا' بہت پسند آیا۔ 'میں بڑا ہو گیا' کہانی نے بہت ہنسایا۔ دعا کریں کہ آگے بھی میں کوئی خط لکھ سکوں، دل تو بہت چاہ رہا تھا اور کچھ لکھوں لیکن لکھنے کو کوئی لفظ نہیں مل رہا۔ ویسے میں بہت شوق سے بچوں کا اسلام پڑھتی ہوں۔ (ملائکہ حفصہ۔ کوٹ اڈو)

ج: اتنے پرانے اور صرف دو رسالے، پھر شوق سے کیسے پڑھتی ہیں؟

جوابات: آپ کتنے پانی میں ہیں؟ (۱۲)

(۱) حضرت امامہ بنت ابی العاص، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بیٹی ہیں، یوں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نواسی ہوئیں۔

(۲) حضرت سفینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو۔

(۳) بھوپال کی مسجد ''تاج المساجد'' انڈیا کی سب سے بڑی مسجد ہے، جسے بھوپال کی تیسری خاتون حکمراں نواب شاہجہاں بیگم نے تعمیر کروایا۔

(۴) منڈی بہاءالدین۔

(۵) مصنوعی ذہانت (AI) سے مراد ایسے کمپیوٹر سسٹم ہیں جو ایسے کام انجام دے سکتے ہیں جن کے لیے عام طور پر انسانی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے بصری ادراک، تقریر کی شناخت، فیصلہ سازی، اور قدرتی زبان کی پروسیسنگ۔

ماحول سے مطابقت

سر قدیر قریشی

برفانی تیندوا (Snow Leopard) ہمالیہ کے پہاڑیوں کا سب سے بڑا اور کامیاب شکاری (Top predator) ہے۔

اُس کے جسم کے رنگ اور نقوش و نگار ماحول سے اِس قدر زیادہ مطابقت رکھتے ہیں کہ بعض اوقات ہم سامنے موجود تیندوے کو بھی نہیں دیکھ پاتے۔

مثلاً مضمون کے ساتھ موجود پہلی تصویر میں ایک تیندوا ہے جو اس منظر کے رنگوں میں اس قدر گھب رہا اور مل رہا ہے کہ اسے دیکھنا انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔

(کیا آپ ڈھونڈ سکتے ہیں؟)

برفانی تیندوے کا یہ کیموفلاژ (camouflage) اسے اپنے شکار میں مدد دیتا ہے۔ اس کے شکار جانور اس کی موجودگی کا احساس کیے بغیر بے فکری سے اُس کے پاس گھومتے پھرتے ہیں۔ تیندوا موقعے کی تاک میں رہتا ہے اور پھر اچانک بجلی کی پھرتی سے اپنے شکار پر حملہ کر دیتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ اس کیموفلاژ کے باوجود برفانی تیندوے کے حملے صرف لگ بھگ چالیس فیصد ہی کامیاب رہتے ہیں جبکہ ساٹھ فیصد حملوں میں شکار بچ نکلتا ہے۔

کبھی آپ نے سوچا کہ کیموفلاژ کا یہ عمل کیسے ہوتا ہے؟

دراصل یہ ہزاروں برس کا عمل ہے۔

تیندوے کے اجداد میں کچھ کا رنگ مختلف رہا ہوگا۔ اُن میں سے جن اجداد کا رنگ ماحول سے زیادہ ملتا جلتا تھا اُن کے لیے شکار کرنا زیادہ آسان تھا، کیونکہ وہ بغیر دوسرے جانوروں کی نظروں میں آئے چھپ کر شکار کا انتظار کر سکتے تھے، جبکہ جن تیندوں کا رنگ ایسا تھا کہ وہ دور ہی سے نظر آ جاتے تھے، اُن کے لیے شکار کرنا اسی قدر زیادہ مشکل تھا، اس لیے ان کی بقا کا امکان بھی قدرے کم تھا (اگرچہ صفر نہیں تھا)۔

فرض کیجیے کہ جن تیندوں کا رنگ ماحول کے مطابق تھا، ان کے زندہ رہنے اور نسل آگے بڑھنے کا امکان ۹۰ فیصد ہے جبکہ جو ماحول سے مختلف نظر آتے ہیں، ان کا امکان ۷۰ فیصد ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلی کی آبادی زیادہ تیزی سے بڑھے گی۔

اس عمل کو (differential reproductive success) کہا جاتا ہے۔

اگر کسی وجہ سے اِس علاقے میں قحط آتا ہے اور شکار کی تعداد کم ہو جاتی ہے تو اس بات کا امکان موجود ہے کہ صرف وہی تیندوے شکار کر پائیں گے جن کا کیموفلاژ بہت اچھا ہے، یوں ہزاروں نسلوں پر محیط اس (boom and bust cycle) میں صرف وہی جانور بچ رہیں گے جن کا کیموفلاژ اچھا ہوگا۔

مختصر یہ کہ جن جانوروں کی شباہت اور رنگ روپ اپنے ماحول سے ملتے جلتے ہیں، انھیں دیکھنا درندوں کے لیے مشکل ہوتا ہے، اس لیے وہ بقا کی جنگ میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں، جبکہ جن جانوروں کو دیکھنا آسان ہوتا ہے وہ کسی درندے کا لقمہ بن جاتے ہیں۔

اسی طرح وہ درندے جو شکار کرتے ہیں، اگر ان کی شباہت اور رنگ روپ اپنے ماحول سے ملتے جلتے ہیں تو ان کے لیے شکار کرنا آسان ہوتا ہے، اور اگر ان کا دیکھنا آسان ہو تو شکار کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

☆☆

تیندوے والی تصویر کے علاوہ ایک اور تصویر بھی پیشِ خدمت ہے، جس میں ایک درخت کا تنا نظر آ رہا ہے، اس تصویر میں ایک سانپ کیموفلاژ ہے۔ اسے بھی ڈھونڈیے اور اش اش کر اٹھیے کہ کس خوبصورتی سے قدرت نے اُسے کیموفلاژ کیا ہے……!

(مرسلہ: یحییٰ امتیاز خان۔ کراچی)